بھٹو کے
آخری 323 دن

راولپنڈی جیل کے سابق سیکیورٹی سپرنٹنڈنٹ

کرنل رفیع الدین

کے مشاہدات اور انکشافات

AHMAD
PUBLICATIONS

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بھٹو کے
آخری 323 دن

کرنل رفیع الدین

جملہ حقوق محفوظ©

پہلا ایڈیشن: .... نومبر 1991ء

بارھواں ایڈیشن: .... جنوری 2007ء

ٹائٹل ڈیزائن: .... سیّد سلمان حسن

پرنٹر: .... حاجی حنیف پرنٹرز

قیمت: .... =/180 روپے

[redacted]

مشتاق بک کارنر، اُردو بازار لاہور۔ فون: 7230350

علم و عرفان، اُردو بازار لاہور۔ فون: 7352332

نگارشات، مزنگ روڈ لاہور۔ فون: 7322892

ویلکم بک پورٹ، اُردو بازار کراچی۔ فون: 2633151

اشرف بک ایجنسی، کمیٹی چوک راولپنڈی۔ فون: 5531610

فہرست

ابتدائیہ	9
تیاری اور پیش بندی	13
آمد و معمولات	19
ابتدائی ایام	29
مزید احتیاطیں	49
بھٹو صاحب کی باتیں	57
سپریم کورٹ میں اپیل	81
آخری لمحات	113
ضمیمہ جات	
میرے جنرل ضیاء الحق سے تعلقات	131
ملاقاتوں کا ریکارڈ	137

ابتدائیہ

اسپیشل سروس گروپ (ایس ایس جی) جو عموماً کمانڈوز کے نام سے مشہور ہے' پاکستان فوج کا انتہائی اہم شعبہ ہے۔ جنگ کے دنوں میں کمانڈوز کو انتہائی خطرناک اور مشکل مشن سونپے جاتے ہیں' لیکن امن کے دنوں میں بھی وہ جان ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں۔ ان کے فرائضِ منصبی میں قومی رہنماؤں کی حفاظت' وطن میں آنے والی بین الاقوامی شخصیات کی سلامتی' حساس اداروں کی نگہداشت' اہم فوجی اور نہایت حساس دفاعی تنصیبات کی رکھوالی' اندرونی و بیرونی پروازوں میں طیاروں کے اغوا کی ممکنہ کوششوں کی روک تھام وغیرہ شامل ہیں۔ غرض ان جاں بازوں کو جس کام کیلئے بھی پکارا جائے وہ لبیک کہنے اور ہمیشہ اپنا فرض پوری جانفشانی سے نبھانے کیلئے مستعد اور کمربستہ رہتے ہیں۔

مقامِ فخر ہے کہ میرا تعلق بھی پاک فوج کے اس مایۂ ناز اور فعال شعبے سے رہا ہے۔ فوجی زندگی تو ویسے بھی سخت جانی کا تقاضا کرتی ہے لیکن اسپیشل سروس گروپ کے معمولات اور بھی گمبھیر اور کٹھن ہوتے ہیں۔ پیشہ ورانہ فرائض کی ادائیگی کے وقت' پاک و ہند جنگوں کے دوران یا امن کے دنوں میں بہت سے واقعات ایسے بھی پیش آئے جو روایتی کہانیوں' افسانوں اور داستانوں سے بھی زیادہ دلچسپ تھے۔ 1978-79ء میں مجھے ایک ایسی ذمہ داری سونپی گئی جو نزاکتوں اور احتیاطوں کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ بلاشبہ سنگین ذمہ داری تھی۔

لاہور ہائیکورٹ نے 18 مارچ 1978ء کو جناب ذوالفقار علی بھٹو کو نواب محمد احمد خان قصوری

کے قتل کے جرم میں سزائے موت کا فیصلہ صادر کیا۔ اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ آف پاکستان میں اپیل دائر کی گئی تو انتظامیہ نے فیصلہ کیا کہ بھٹو صاحب کو کوٹ لکھپت جیل لاہور سے راولپنڈی سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا جائے تاکہ سماعت کے دوران انہیں باآسانی عدالت میں پیش کیا جا تا رہے۔

بھٹو صاحب کوئی معمولی آدمی نہیں تھے، ملک کے صدر اور وزیر اعظم رہ چکے تھے۔ ان کی حفاظت اور سیکورٹی کیلئے غیر معمولی اقدامات کی ضرورت تھی اور یہ ذمہ داری میرے سپرد کر دی گئی۔

اس کام کیلئے میرا انتخاب کیوں کیا گیا؟ میں سمجھتا ہوں یہ محض اتفاق تھا۔ میرے لئے اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ اس انتخاب میں صدر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کا ہاتھ ہو، اسلئے کہ میری ان سے کوئی شناسائی نہ تھی۔ ان سے میری صرف ایک سرسری سی ملاقات ہوئی تھی، جس کیلئے شاید ملاقات کا لفظ بھی موزوں نہ ہو۔ چیف آف آرمی اسٹاف کے عہدے پر ترقی پانے کے بعد وہ اسکول آف انفینٹری اینڈ ٹیکٹکس، کوئٹہ تشریف لائے، جہاں میں بطور چیف انسٹرکٹر تعینات تھا۔ حسب دستور ادارے کے تمام افسروں کا ایک قطار میں تعارف کرایا گیا، جہاں مجھے بھی معزز مہمان سے ہاتھ ملانے کا شرف حاصل ہوا۔ بعد میں چائے کی ایک تقریب میں ان سے رسمی آمنا سامنا بھی ہوا۔ بعد ازاں جو تعلق اور راہ و رسم صدر صاحب کے ساتھ رہی اس کی تفاصیل کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ میں بیان کر دی گئی ہیں۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بھٹو صاحب کی سیکورٹی کیلئے میرا انتخاب محض اتفاق تھا۔ جب انہیں لاہور سے راولپنڈی منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو میں راولپنڈی چھاؤنی میں 27 پنجاب رجمنٹ کی کمانڈ کر رہا تھا جو 111 بریگیڈ کا حصہ تھی۔ اس بریگیڈ کی کمانڈ، بریگیڈیئر ایم ممتاز ملک کے ہاتھ میں تھی۔ دارالحکومت اور راولپنڈی میں پریذیڈنسی کی حفاظت اسی بریگیڈ کے سپرد تھی۔ مارشل لاء انتظامیہ میں بریگیڈیئر ممتاز سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے منصب پر فائز تھے۔ بھٹو صاحب کی دیکھ بھال اور حفاظت کی ذمہ داری تو انہی کی تھی، لیکن بالواسطہ یہ ذمہ داری انہیں اپنے ماتحت تین یونٹ کمانڈروں میں سے کسی ایک کے سپرد کرنا تھی۔ ہو سکتا ہے کہ میرا انتخاب میرے کمانڈو ہونے اور بیس سال کے بے داغ کردار اور سروس ریکارڈ کے پیش نظر کیا گیا ہو۔

پھانسی کی سزا پانے تک میں بھٹو صاحب کی زندگی کے آخری 323 دنوں میں ان کی حفاظت پر مامور رہا۔ اس دوران اکثر و بیشتر ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان سے باتیں کرنے بلکہ یوں کہئے کہ ان کی باتیں سننے کا کافی موقع ملا۔ ان کے معمولات قریب سے دیکھے، ان سے ملنے کیلئے آنے والوں کی ملاقاتوں کے سلسلۂ دراز کا کافی تفصیل کے ساتھ علم ہوا۔ غرض ان کی زندگی کے آخری 323 شب و روز کا میں قریبی عینی شاہد ہوں۔ بھٹو صاحب کیا تھے اور تاریخ میں ان کا مقام کیا ہے؟ اس کا فیصلہ آنے والا وقت کرے گا یا مؤرخ۔ اس عرصے کے دوران میں نے جو کچھ دیکھا اور سنا اسے من و عن، بلا کم و کاست قوم تک پہنچانے کی جسارت کر رہا ہوں تاکہ اس ضمن میں جتنی بے سروپا، بے بنیاد، من گھڑت اور جھوٹی کہانیاں

زباں زدِ عام رہی ہیں 'ان کا ازالہ ہو جائے اور قوم پر حقیقی صورتحال واضح ہو سکے۔

مختلف اوقات میں مختلف افراد نے مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں یہ یادداشتیں ان کے حوالے کر دوں یا انہیں ان کی مرضی کے مطابق مرتب کروں لیکن اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ میں نے مختلف دھمکیوں کے باوجود اپنی جان کا خطرہ مول لے کر ان کی اس خواہش کو شرمندۂ تکمیل نہیں ہونے دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اسے اپنے ضمیر کے مطابق مرتب کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔

اس کتاب میں جو کچھ بھی ہے میری دید و شنید کا ایک ریکارڈ ہے۔ میں نے پوری کوشش کی ہے کہ جو کچھ بھی میرے علم میں آیا ہے اسے پوری دیانتداری سے قوم کے سامنے لے آؤں۔ اس تحریر سے میرا مقصد نہ تو کسی کی خوشنودی حاصل کرنا ہے اور نہ ہی اس سے کسی کی دل آزاری مطلوب ہے۔ میری تو صرف یہ کوشش رہی ہے کہ کسی حال میں بھی سچ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ علاوہ ازیں مجھے اپنی سپاہیانہ زندگی اور پیشہ ورّانہ مقاصد کی صداقتوں پر فخر ہے۔ میرا سیاست سے کوئی سروکار نہیں رہا' نہ میں نے کبھی کسی سیاسی پارٹی کے ساتھ کوئی تعلق پیدا کیا۔ میں ایک خالص پاکستانی شہری ہونے کے ناطے سے تمام آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی باتوں پر مشتمل روداد لکھ رہا ہوں۔ میں اس کتاب کے صحیح تجزیئے کیلئے ہر پڑھنے والے کے حق کو تسلیم کرتا ہوں۔

بدقسمتی سے پاکستان میں آج تک کسی بھی قومی المیے کے بارے میں عوام کو اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ کے آخری ایام کے حالات اور ان کی موت کس کسمپرسی کی حالت میں واقع ہوئی؟ مشرقی پاکستان کے سانحے کے کون ذمہ دار تھے؟ یا لیاقت علی خان کے قاتل کون تھے اور ان کا مقصد کیا تھا؟ صدرِ پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق مع ہماری افواج کے تین درجن بہترین افسران و جرنیل صاحبان کی موت کا کون ذمہ دار ہے؟ اور پھر پاکستان کے وزیرِاعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ کیا ہوا؟ یہ سب ہماری قوم کے ایسے المیے ہیں جن کے متعلق قوم کو آج تک کوئی حقیقت نہیں بتائی گئی۔

چونکہ میں ان قومی المیوں میں سے کم از کم ایک المیے کا عینی شاہد ہوں اسلئے میں متعلقہ واقعات کی اس امانت کو قوم کے سامنے پیش کرنے کی تمنّا رکھتا ہوں۔

میں نے ہر لحاظ سے کوشش کی ہے کہ بھٹو صاحب پر ان کے آخری 323 ایام میں جو کچھ گزری اسے پوری ایمانداری کے ساتھ قلم بند کر دوں۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں نے حق بیانی سے کام لیا ہے۔ اس میں نہ بھٹو صاحب کی طرفداری کی ہے اور نہ حکومت کی کسی بات کو چھپایا ہے۔ البتہ میں نے ان کی چند ایسی باتیں اس کتاب میں شامل نہیں کیں جو ناشائستگی کے زمرے میں آتی ہیں اور کچھ ایسی باتیں بھی جن کا اظہار قومی مفاد میں نہیں ہے۔

تیاری اور پیش بندی

میں 1978ء میں راولپنڈی چھاؤنی میں 27 پنجاب رجمنٹ کی کمان کر رہا تھا۔ میری پلٹن 111 بریگیڈ کے تحت تھی۔ مئی 1978ء کے پہلے ہفتے کے دوران ایک روز مجھے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کی طرف سے حکم ملا کہ میں ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی میں رپورٹ کروں۔ جیل پہنچنے پر میں نے کمانڈر 111 بریگیڈ بریگیڈیئر ایم ممتاز ملک، جو سب مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر (ایس ایم ایل اے) کی ڈیوٹی بھی انجام دے رہے تھے، کمشنر اور ڈپٹی کمشنر راولپنڈی، سپرنٹنڈنٹ انجینئر راولپنڈی اور جیل سپرنٹنڈنٹ چودھری یار محمد کو وہاں موجود پایا۔ کچھ دیر میں میجر جنرل شاہ رفیع عالم جو اس وقت ڈپٹی مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر (ڈی ایم ایل اے) بھی تھے، تشریف لے آئے۔ ہم سب نے ایک ساتھ جیل میں عورتوں کے وارڈ کو گھوم کر دیکھا۔ جنرل صاحب نے جیل کے اندر زور و شور سے ہونے والے تعمیراتی کام کے بارے میں چند ہدایات دیں اور پھر گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے چلے گئے۔ بعد ازاں مجھے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر طلب کیا گیا جہاں بریگیڈ کمانڈر ایم ممتاز ملک نے میرے نئے فرائض سے متعلق مجھے ضروری ہدایات دیں۔ تب پتہ چلا کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو کو 18 مارچ 1978 کو نواب محمد احمد خان قصوری کے قتل کے جرم میں لاہور ہائیکورٹ کے فیصلے میں جو موت کی سزا سنائی گئی تھی، اس کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی گئی ہے اور انتظامیہ نے فیصلہ کیا ہے کہ سماعت کے دوران بھٹو صاحب کو کوٹ لکھپت جیل لاہور سے راولپنڈی جیل منتقل کر دیا جائے تاکہ سپریم کورٹ میں بھٹو صاحب کی پیشی کا عمل انتظامیہ کیلئے نسبتاً آسان ہو جائے۔ اس مقصد

کیلئے کچھ عرصہ پہلے 10 کور ہیڈ کوارٹر راولپنڈی اور مارشل لاء حکام نے طے کیا تھا کہ خاتون قیدیوں کے لئے مخصوص وارڈ کو سیکورٹی وارڈ کی شکل دے کر سنٹرل جیل راولپنڈی میں اسیری کے دوران ذوالفقار علی بھٹو کی حفاظت کو یقینی بنایا جائے۔ اس مقصد کیلئے جیل کے اندر دن رات ہنگامی بنیاد پر سرگرمی سے کام جاری تھا۔ ایس ایم ایل اے نے مجھے بتایا کہ بھٹو صاحب کی اسیری کے دوران میری پلٹن کو پنڈی جیل میں ان کی حفاظت کی اضافی ذمہ داری تفویض کی گئی ہے۔ تیار کردہ سیکورٹی وارڈ کا نقشہ کچھ یوں تھا

سیکورٹی وارڈ۔ سنٹرل جیل راولپنڈی کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی ایک ڈیوڑھی آتی ہے جس کے بائیں جانب جیل کے دفاتر ہیں' دالان کے پار اندر پھر دوسرا آہنی دروازہ ہے۔ اس کے بعد کھلی جگہ ہے۔ یہاں سے بائیں ہاتھ پر قیدیوں کا لنگر خانہ ہے اور دائیں ہاتھ کچھ فاصلے پر ایک الگ تھلگ عمارت ہے۔ بھٹو صاحب کی اس جیل میں اسیری سے پیشتر یہ الگ تھلگ عمارت قیدی خواتین کا وارڈ کہلاتی تھی۔ اب یہ عمارت کسی قدر ترمیم و توسیع کے بعد سیکورٹی وارڈ کے نام سے موسوم ہوئی۔ ابتدا میں یہ تجویز کیا گیا تھا کہ مجرم خواتین کو جیل میں کسی اور جگہ منتقل کر دیا جائے اور یہ وارڈ ذوالفقار علی بھٹو کیلئے استعمال کیا جائے۔ خواتین وارڈ آٹھ کوٹھڑیوں پر مشتمل تھا۔ چار کوٹھڑیاں ایک جانب اور چار دوسری جانب اور درمیان میں چند فٹ چوڑا دالان (Corridor) شمالاً جنوباً واقع تھا۔ دالان کے دونوں کناروں پر آہنی دروازے نصب تھے۔ ہر کوٹھڑی تقریباً 12 فٹ لمبی اور ساڑھے سات فٹ چوڑی تھی۔ جنوب والے آہنی دروازے کے باہر تقریباً 34 × 36 فٹ کا ایک صحن تھا۔ جس کے گرد تقریباً 8 فٹ اونچی دیوار تھی' اس صحن کی مشرقی طرف ایک دروازہ تھا جو ضرورت پڑنے پر بند کر دیا جاتا تھا۔ زنانہ وارڈ کے شمالی آہنی دروازہ اور ملحقہ دو کوٹھڑیوں کو فرش سے لے کر چھت تک ایک مضبوط دیوار کے ذریعے الگ کر کے اس حصہ کو مستقل طور پر بند کر دیا گیا جہاں ضروری آلات وغیرہ لگائے گئے جن کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔ بھٹو صاحب کو یہاں لانے سے پہلے سیکورٹی وارڈ میں درج ذیل ترامیم و اضافہ کیا گیا۔

اصلاح و مرمت۔ بھٹو صاحب کی آمد سے پہلے یہ کوٹھڑیاں حفظانِ صحت کے اصولوں پر از سرِ نو تیار کی گئیں۔ ہر چند یہ ترمیم و توسیع سیکورٹی کے نقطۂ نظر سے کی گئی تھی پھر بھی اس عمل کی بدولت وارڈ میں صاف ستھرا اور صحت مند ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ فرش' چھت اور دیواروں کی مرمت میں سیکورٹی کے تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں کی گئیں۔ باہر سے جیل کے اندر سیکورٹی وارڈ تک سرنگ لگانے کو ناممکن بنانے کی خاطر کچے فرش کو کھود کر اس کی جگہ لوہے اور کنکریٹ کا مضبوط فرش بنایا گیا۔ بدنما چھت کو چھپانے کیلئے اصلی چھت سے چند فٹ نیچے آہنی چھت بنائی گئی۔ اس کے نیچے لوہے کی موٹی چادروں سے **سیلنگ** کر دی گئی جس کی نچلی طرف خوشنما سفید رنگ و روغن کر دیا گیا۔ پرانی اور نئی آہنی چھتوں کے خلا کے درمیان خار دار تاروں کے گچھے بھر دیئے گئے۔ اس ساری تبدیلی اور تیاری کا اصل مقصد یہ تھا کہ بھٹو صاحب کو چھت توڑ کر بھگا لے جانے کے امکان کو ختم کیا جا سکے۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر تمام کوٹھڑیوں کی دیواروں

پر، جو پہلے ہی مضبوط پتھر سے بنائی گئی تھیں، موٹے پلستر کی تہیں چڑھادی گئیں تاکہ حفاظت کے ساتھ ساتھ صحت وصفائی کے خصوصی اہتمام کا تاثر بھی پیدا ہو سکے۔ سیکورٹی وارڈ میں حفظانِ صحت کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ وارڈ میں پانی اور بجلی کا بھی معقول انتظام تھا۔ اس وارڈ کو باقی جیل سے بالکل الگ تھلگ کرنے کیلئے ڈیوڑھی سے لے کر جیل فیکٹری کی دیوار تک اور پرانے زنانہ وارڈ کے اردگرد واقع تمام کھلے علاقے کے ساتھ ساتھ اوپر تلے خاردار تاروں سے ایک دفاعی حصار تعمیر کر دیا گیا تھا۔ اس دفاعی حصار میں ایک گیٹ بنایا گیا جو سیکورٹی وارڈ میں آنے جانے کا واحد راستہ تھا۔ اس کانٹے دار دفاعی حصار کے اندر اور گرداگرد گول گچھوں والے خاردار تار کے پانچ گچھے 'تین نیچے اور دو اوپر' پھیلا دینے سے یہ ایک ناقابلِ عبور رکاوٹ بن گئے۔ ایک گچھے کی گولائی تقریباً ایک میٹر اونچی اور ایک میٹر چوڑی ہوتی ہے۔ بیچ میں دس پندرہ فٹ خالی جگہ چھوڑ کر سیکورٹی وارڈ کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ ہر طرف اسی طرح کی ایک اور رکاوٹ بھی بنادی گئی تھی تاکہ سیکورٹی وارڈ پر کسی بھی نوعیت کے ممکنہ حملے یا وہاں سے بھٹو صاحب کے فرار کی کوشش کو ناکام بنایا جاسکے۔

نگرانی کے مینار۔ سیکورٹی وارڈ کے اردگرد کانٹے دار تاروں کی دو رکاوٹوں کے درمیان دس پندرہ فٹ خالی جگہ پر لکڑی اور فولاد سے پانچ مینار تعمیر کئے گئے تھے، جن پر ہروقت چاق وچوبند اور مستعد نگہبان پہرہ دیا کرتے تھے۔ بعدازاں جب شریک مجرموں کے وارڈ کی جانب ایک نئی عمارت تعمیر ہوئی تو اسکی دوسری منزل پر نگرانی کا ایک اور مینار بھی تعمیر کر دیا گیا تھا۔ سیکورٹی وارڈ اور اس کے آس پاس کے علاقے میں سرچ لائٹ سے روشنی کا انتظام کیا گیا۔ برقی رو کے اچانک بند ہوجانے یا کاٹ دینے کی ممکنہ صورتحال سے نبٹنے کی خاطر متبادل کے طور پر ایک جنریٹر کے علاوہ ایک قابلِ اعتماد الارم سسٹم بھی مہیا کر دیا گیا تھا۔

آپریشن روم۔ ڈیوڑھی سے اوپر کی منزل میں آپریشن روم قائم کر دیا گیا۔ یہاں پہلے ہی سے دو کمرے موجود تھے، جن میں جیل کا ریکارڈ محفوظ رہتا تھا۔ اب یہ ریکارڈ کسی اور جگہ منتقل کر دیا گیا۔ ان میں سے کمرے میں ہروقت ڈیوٹی آفیسر موجود رہتا اور دوسرا نگہبانوں کی آرام گاہ بن گیا۔ ضروری نقشے اور چارٹ' وائرلیس سیٹ' ٹیلیفون اور ڈیوٹی آفیسرز لاگ بک (Log Book) وغیرہ آپریشن روم میں رکھے گئے اور ان کمروں کی چھت کو ایک باقاعدہ چوکی کی شکل دیدی گئی۔ چھت کی اس چوکی سے سیکورٹی وارڈ کی ہر نقل وحرکت کے علاوہ تقریباً ساری جیل' جیل کے مضافات خصوصاً بڑی سڑکیں اور جیل کے صدر دروازے کے سامنے کا سارا علاقہ صاف نظر آتا تھا۔ سیکورٹی وارڈ اور جیل تک پہنچنے والے تمام راستوں پر نظر رکھنے کی خاطر ڈیوڑھی کی چھت پر باضابطہ سنتری پوسٹیں تعمیر کی گئیں جن میں اسلحہ جات رکھنے کا بندوبست بھی کر دیا گیا تاکہ کسی بھی ناگہانی صورتحال سے نبٹا جاسکے۔ یہ چھت ہوائی حملوں کے خطرات کی روک تھام کا بھی نہایت عمدہ ذریعہ ثابت ہوئی۔ چنانچہ یہاں دونوں قسم کی مشین گنیں یعنی ڈمنی اور طیارہ شکن توپیں' دفاعی مقصد کیلئے نصب کر دی گئیں۔ مزید برآں جیل اور اس کے مضافات میں

ایک طیارہ شکن بیٹری بھی متعین کر دی گئی۔ یہ تمام انتظامات 15 مئی 1978ء تک مکمل کر دیئے گئے اور 17 ۔ 18 مئی کی درمیانی شب کو میری بٹالین بھی جیل کے شمالی حصے کی پولیس لائنوں میں متعین کر دی گئی۔

سیکورٹی فورس اور اس کے فرائض

بھٹو صاحب کی اسیری کے دوران ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی کے تحفظ کی خاطر محکمہ جیل خانہ جات' پولیس اور فوج کی درج ذیل فورسز تعینات رہیں۔

محکمہ جیل خانہ جات

(الف) سپرنٹنڈنٹ جیل راولپنڈی کی سرکردگی میں سنٹرل جیل کا موجودہ اسٹاف

(ب) انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات نے سپرنٹنڈنٹ جیل راولپنڈی کو مزید 50 وارڈرز کی اضافی فورس بھی بھیج دی۔

محکمۂ پولیس

(ا) ایس ایس پی راولپنڈی کی سرکردگی میں ضلعی پولیس

(ب) ایس ایس پی راولپنڈی کو پولیس ٹریننگ کالج سہالہ سے پانچ سو سپاہیوں پر مشتمل ایک اضافی پولیس فورس بھی مہیا کر دی گئی۔

(ج) آئی جی اور ڈی آئی جی کی ریزرو فورس میں سے پانچ سو (500) مزید جوان بھی ایس ایس پی راولپنڈی کے ماتحت کر دیئے گئے۔

محکمہ فوج

(الف) 27 پنجاب رجمنٹ کو بطور سیکورٹی بٹالین متعین کیا گیا۔

(ب) ایک کمپنی ایکس 3 ایف ایف رجمنٹ کو بطور سپیشل ٹاسک فورس متعین کیا گیا۔

(ج) بیٹری 94 لائٹ انٹی ایئر کرافٹ رجمنٹ کو بطور سپیشل ٹاسک فورس متعین کیا گیا۔

فرائض۔ سیکورٹی فورس کو مندرجہ ذیل غیر متوقع حادثات سے فوری طور پر عہدہ بر آ ہونے کا مشن سونپا گیا۔

(الف) بڑے مجرم ذوالفقار علی بھٹو کا اقدامِ خودکشی۔

(ب) بڑے مجرم کے پانی یا خوراک میں زہر خورانی سے یا جیل کے اندر یا جیل سے سپریم کورٹ آتے جاتے دھماکہ خیز مادہ سے یا پھر جیل سے سپریم کورٹ آتے جاتے پہلے سے طے شدہ منصوبہ کے مطابق سڑک پر حادثہ کے ذریعے قتل کی سازش۔ ان متوقع اقداماتِ قتل میں ذوالفقار علی بھٹو کو سیکورٹی وارڈ یا

پورے جیل میں آتش زنی کے ذریعے ہلاک کرنے کا اقدام بھی پیش نظر تھا۔
(ج) سیکورٹی وارڈ میں سرنگ لگا کر فرار ہونے یا بھگا لے جانے کی کوشش۔
(د) زمینی حملے سے اغوا کی کوشش۔
(ر) ہوائی حملے کے ذریعے اغوا کی کوشش۔
(س) باہر کی مدد یا باہر کی مدد کے بغیر جیل کے اندر فساد برپا کر کے یا غدر مچا کر مسٹر بھٹو کی رہائی کی کوشش۔
(ص) جیل یا سپریم کورٹ پر یا راستے میں عوامی ہجوم کا حملہ۔

جیل، پولیس اور فوج کی سیکورٹی فورس کو ان تمام متوقع کارروائیوں کی صورت میں درج ذیل واضح اور قطعی ذمہ داریاں تفویض کی گئی تھیں۔

(الف) جیل کے اندر داخل ہونے کے بعد جیل کی چار دیواری میں بڑے قیدی مجرم کے تحفظ کی تمام تر ذمہ داری جیل حکام پر تھی۔ سپرنٹنڈنٹ جیل اور اس کے ماتحت عملہ کو درج بالا کسی بھی ہنگامی صورتحال میں ذوالفقار علی بھٹو کی پوری حفاظت کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا۔

(ب) جیل سے باہر مسٹر بھٹو کی حفاظت کا فریضہ راولپنڈی ڈسٹرکٹ پولیس کے ذمہ تھا۔ جیل سے سپریم کورٹ تک اور سپریم کورٹ کے اندر حفاظت کی ذمہ داری ایس ایس پی راولپنڈی اور اس کی زیر کمان پولیس فورس پر عائد تھی، اور یوں ایس ایس پی کسی بھی ہنگامی صورتحال کیلئے تیار رہتا تھا۔

(ج) ان کارروائیوں کی نگرانی، انتظام اور بروقت رہنمائی فوج کے ذمہ تھی۔ سیکورٹی بٹالین کمانڈر کو مارشل لاء کی جانب سے حفاظتی انتظامات کی اعلیٰ تر نگرانی کا کام سونپا گیا تھا۔

خفیہ آلات۔ مئی 1978ء کے دوسرے ہفتے میں یعنی بھٹو صاحب کی پنڈی جیل میں آمد سے صرف چند روز پیشتر مجھے اطلاع دی گئی کہ ایک انٹیلی جنس ایجنسی کی طرف سے فلاں صاحب ضروری ساز و سامان لے کر آئیں گے اور سیکورٹی وارڈ کی اس کوٹھڑی میں، جہاں بھٹو صاحب کو رکھنا مقصود ہے، کچھ خفیہ آلات نصب کریں گے، تاکہ سیکورٹی کا جامع اور مکمل بندوبست ہو سکے۔ چنانچہ اگلی صبح ایک ڈائریکٹر کے ہمراہ دو ٹیکنیشنز آئے اور انہوں نے اس کوٹھڑی کی دیوار میں خفیہ جاسوسی آلات نصب کئے جس میں بھٹو صاحب کو رکھا جانا تھا۔ یہ آلات وائرلس (Wireless) کے علاوہ زیر زمین تار سے بھی جوڑ دیئے گئے جو جیل سپرنٹنڈنٹ کے دفتر کے متصل کمرہ میں لے جایا گیا۔ ایک دو ہفتوں بعد یہ زیر زمین تار بڑھا کر میری پلٹن کے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے تک بھی پہنچا دیا گیا، تاکہ جیل میں کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکے کہ ان خفیہ آلات سے کس وقت کام لیا جاتا ہے اور کس وقت ڈیوٹی پر انٹیلی جنس کے خاص آدمی موجود نہیں ہوتے۔ شروع شروع میں یہ آلات پورا دن اور گئی رات تک کام کرتے رہے مگر چند ہفتوں بعد چونکہ بھٹو صاحب کے پاس رات کو کوئی آدمی نہ جاتا تھا اس لئے آپریٹرز ان آلات کو شام آٹھ نو بجے کے قریب بند کر کے واپس چلے جاتے اور پھر صبح آ کر تمام دن نگرانی کی جاتی۔ خرابی یا ترمیم کی حالت میں ان

آلات تک پہنچنے کیلئے سیکورٹی وارڈ کے شمالی دو کمرے ایک نئی دیوار تعمیر کر کے الگ کر دیئے گئے اور انہیں جیل کے ہر شخص کیلئے آؤٹ آف باؤنڈ (Out of Bound Area) قرار دیدیا گیا تاکہ یہ خفیہ آلات ان کی پہنچ سے باہر اور محفوظ رہیں۔

یہ تھے وہ حفاظتی انتظامات جو اسیری کے دوران بھٹو صاحب کی حفاظت کو یقینی بنانے کیلئے انکو سنٹرل جیل راولپنڈی لانے سے پہلے عمل میں لائے گئے۔ ویسے ان کی اسیری کے دوران نت نئے واہمے اور مفروضے جنم لیتے رہے اور ان کے توڑ بھی صادر ہوتے رہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ذوالفقار علی بھٹو کی شخصی ہیبت اور عوامی مقبولیت کی شدید دہشت طاری ہے اور ان تہہ در تہہ حفاظتی اقدامات کے باوجود کسی غیر متوقع اور اچانک اقدام سے بھٹو صاحب کے بچ نکلنے کے کئی امکانات موجود ہوں۔ سنگ و آہن کی دیواروں اور فولادی چھتوں کے اندر محبوس ایک شخص کی نگرانی پر مامور دائرہ در دائرہ مسلح دستوں کی موجودگی نے بھی ہماری نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ لیکن دوسری طرف جب میں بھٹو صاحب کی طرف دیکھتا تو وہ ہمیشہ مجھے بے پروائی اور بے نیازی ہی کے عالم میں نظر آتے۔

آمد اور معمولات

سب مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر' بریگیڈیئر ایم ممتاز ملک نے 14 مئی 1978ء کو مجھے طلب کیا اور بھٹو صاحب کی آمد پر کئے جانے والے انتظامات پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے کہا کہ بھٹو صاحب کی آمد بے وقت ہوگی۔ کوٹ لکھپت جیل لاہور سے انہیں ہوائی جہاز یا ہیلی کاپٹر یا گاڑی میں لایا جائے گا۔ انہیں پی اے ایف بیس چکلالہ' آرمی ایوی ایشن بیس دھمیال یا سہالہ ریسٹ ہاؤس میں سے کسی ایک جگہ اتارا جاسکتا ہے۔ ہم نے مختلف احوال و مقامات کیلئے مختلف کوڈ ورڈ مقرر کئے اور آمد کے موقع پر ضروری حفاظتی اقدامات پر تبادلہ خیال کیا۔ طے پایا کہ آمد کے مقام سے سنٹرل جیل راولپنڈی تک محفوظ سفر کی ذمہ داری ایس ایس پی راولپنڈی کی ہوگی مگر اس کے باوجود مجھ پر حفاظت کی اضافی ذمہ داریاں عائد کی گئیں۔ چنانچہ میں نے اس سلسلہ میں ضروری اقدامات کیلئے اپنے ایڈجوٹنٹ کیپٹن وقار احمد راجہ کو اعتماد میں لیا اور اپنی پلٹن کے پہلے آدمی کو اس تمام حفاظتی حصار کے پس منظر سے آگاہ کیا۔

16 مئی 1978ء کی رات کو تقریباً گیارہ بجے ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے سے میں بیدار ہوا۔ بریگیڈیئر ممتاز ملک نے فون پر مجھے ہدایات دیں کہ میں اگلی صبح 5 بجے "ساؤتھ انڈ سے صوفہ سیٹ" وصول کرلوں۔ میں نے فوراً کیپٹن وقار کو فون کے ذریعے اطلاع دی کہ وہ صبح سویرے پانچ بجے سے مناسب وقت پیشتر اپنی پارٹی کو لے کر "صوفہ سیٹ" وصول کرنے ساؤتھ انڈ پہنچ جائیں اور بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہدایات پر عمل کریں۔ انہوں نے آگے اپنے ماتحتوں کو ایسی ہی ہدایات دی ہوں گی' اور جیسا کہ فوج کا

دستور ہے وقت سے بہت پہلے مجوزہ اقدامات کیلئے تیاریاں زور شور سے شروع ہو گئی ہوں گی۔ مگر تیار ہونے والوں کو اس بات کا قطعاً کوئی علم نہیں تھا کہ یہ سب تیاری کس مقصد کیلئے ہو رہی ہے۔ صبح دھمیال ایئر بیس جاتے وقت میں نے راستے میں پولیس کے حفاظتی انتظامات کو بھی چپکے چپکے جانچ لیا۔ پانچ بجنے سے پندرہ بیس منٹ پہلے میں دھمیال ایئر بیس پر پہنچا اور دیکھا کہ وہاں کیپٹن وقار کی پارٹی پوری طرح چوکس اور مستعد ہے۔ سگنل کے ساز و سامان سے مواصلات کے نظام سمیت تمام ضروری حفاظتی انتظامات کر لئے گئے تھے۔ میں نے دُور ایک طرف دیکھا کہ ڈائریکٹر جنرل آرمی انٹیلی جنس بھی صبح کی سیر کے لباس میں گھوم رہے ہیں۔

آرمی ہیلی کاپٹر پانچ بج کر پانچ منٹ پر اترا اور دروازہ کھلنے پر بھٹو صاحب ایک پولیس افسر کی معیت میں ہیلی کاپٹر سے باہر آئے۔ انہوں نے نیلے رنگ کا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا اور قدرے کمزوری کے باوجود بہت اسمارٹ نظر آ رہے تھے۔ قیدیوں کی ایک بڑی گاڑی ہیلی کاپٹر کے قریب آئی اور بھٹو صاحب کو اس میں سوار ہونے کو کہا گیا۔ یہ دیکھ کر وہ بہت غضب ناک ہوئے۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس پر وہ یوں گرجے جیسے وہ ابھی تک ملک کے سربراہ ہوں۔ انہوں نے پولیس افسر سے کہا ”تمہیں شرم آنی چاہئے۔ کیا اس سے بہتر گاڑی کا بندوبست نہیں ہو سکتا تھا' وغیرہ وغیرہ؟“

اس طرح خفگی کا اظہار کرنے کے بعد وہ قیدی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ اسی دوران جلدی سے نزدیک والے دفتر سے ان کے بیٹھنے کیلئے ایک کرسی لا کر رکھ دی گئی کیونکہ اس گاڑی میں صرف لکڑی کے بنچ ہی لگے ہوئے تھے۔ ان کے بیٹھتے ہی گاڑی بند کر دی گئی۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ بھٹو صاحب اس ناروا سلوک پر نہایت برہمی سے پولیس کو کوستے رہے۔ انہوں نے کہا ”ایسا سلوک تو جرمنوں نے یہودیوں کے ساتھ بھی نہیں کیا تھا“۔ وہ بار بار اس بات پر ناراض ہوتے رہے کہ پولیس اپنے لیڈر سے 'جو انہی کا نہیں بلکہ تمام تیسری دنیا کا لیڈر بھی ہے' سخت ناروا سلوک کر رہی ہے۔ صبح تڑکے ہی یہ گاڑی راولپنڈی جیل میں داخل ہو گئی اور اتنے سویرے کسی کو بھی پتہ نہ چلا کہ سڑک پر کیا ہو رہا ہے۔ گاڑی کے اندر داخل ہوتے اور جیل کے دروازے بند ہوتے ہی بھٹو صاحب کو سیکورٹی وارڈ میں لے جایا گیا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل چودھری یار محمد کو بھٹو صاحب کو سیدھا کوٹھڑی میں لے جانا تھا لیکن جونہی وہ سیکورٹی وارڈ کے صحن میں پہنچے تو بھٹو صاحب وہاں کھڑے ہو گئے اور لکھپت جیل کے سپرنٹنڈنٹ 'جو بھٹو صاحب کے ہمراہ وہاں سے آئے تھے' باہر کرسیاں منگوا کر بیٹھ گئے اور چائے نوش کی۔ بھٹو صاحب جیل میں قیدیوں کی گاڑی سے جونہی باہر آئے تو انہوں نے سیکورٹی وارڈ کے ارد گرد خاردار تاروں کے ڈھیر اور نگرانی مینار اور پھر صحن میں بیٹھے ہوئے فوجی ٹیلیفون اور باقی دفاعی انتظامات کا غور سے مشاہدہ کیا۔ اتنے میں حکامِ بالا نے دریافت کیا کہ آیا بھٹو صاحب کو سیکورٹی وارڈ کی مخصوص کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا ہے یا نہیں؟ اس پر سپرنٹنڈنٹ جیل کو اپنے فرائض کا احساس دلایا گیا۔ ہر چند بھٹو صاحب صحن میں مزید کچھ دیر بیٹھنا چاہتے تھے مگر وہ انہیں کوٹھڑی میں لے گیا۔

اسی دن یعنی 17 مئی 1978ء صبح دس بجے. بھٹو صاحب نے سپرنٹنڈنٹ جیل کو اپنی کوٹھڑی میں بلوایا اور ان سے دالان (Corridor) میں رکھے ہوئے فوجی ٹیلیفون 'الارم سسٹم کی گھنٹیوں' جیل وارڈر' جو انکی کوٹھڑی پر دالان میں بطور سنتری کھڑا تھا' غسل خانے کے دروازے پر عام کھدّر کے کپڑے کے پردے اور بجلی کے سوئچ اپنی کوٹھڑی کے بجائے باہر دالان میں ہونے پر سخت اعتراض کیا اور مطالبہ کیا کہ ان اعتراضات پر فوراً عمل ہونا چاہئے۔ شاید بھٹو صاحب کو فوجی فیلڈ ٹیلیفون اور الارم سسٹم کی گھنٹیوں سے یہ محسوس ہوا کہ ان میں خاص قسم کے آلات رکھے گئے ہوں گے تاکہ ان کے ساتھ کی گئی ہر قسم کی بات چیت سنی جاسکے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ ان پر کوئی سنتری پہرہ دے۔ غسل خانے پر یا تو صحیح دروازہ ہو یا کم از کم چق پر گہرے رنگ کا کپڑا لگا ہو' تاکہ پردے کا پورا انتظام ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ روشنی اور بجلی کے پنکھے کے سوئچ ان کے سیل کے اندر ہوں تاکہ وہ اپنی مرضی سے انہیں استعمال کر سکیں۔

سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود بھٹو صاحب کو ممکنہ سہولتیں فراہم کی گئی تھیں۔ یہ سہولتیں درجہ اوّل کے قیدیوں کو دی جانے والی سہولتوں سے بھی کہیں زیادہ تھیں۔ یہاں ان میں سے چند ایک سہولتوں کا بیان نامناسب نہ ہو گا۔

رہائش۔ بھٹو صاحب کو چھ کوٹھڑیوں پر مشتمل ایک الگ تھلگ عمارت میں رکھا گیا تھا جس میں ایک صحن بھی موجود تھا۔ (خواتین کے وارڈ کی شمالی دو کوٹھڑیاں ایک مضبوط دیوار بنا کر الگ کر دی گئی تھیں) ایک کوٹھڑی کے بجائے بھٹو صاحب کو چار متصل کوٹھڑیاں دی گئی تھیں۔ ان میں سے کسی کو بھی کال کوٹھڑی قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ یہ کوٹھڑیاں صاف ستھری' روشن اور ہوادار تھیں۔ چار کوٹھڑیوں پر مشتمل یہ مختصر سی رہائش گاہ یوں ترتیب دی گئی تھی۔

1۔ سونے کا کمرہ۔ یہ تقریباً 12 × ½7 فٹ کا کمرہ تھا اور دُور کونے میں ہونے کی وجہ سے دوسرے کمروں کی نسبت اس میں اخفاو خلوت (Privacy) کا اہتمام زیادہ تھا۔ چاروں کے چاروں کمروں میں لوہے کی موٹی سلاخوں والے دروازے نصب تھے' جن میں باہر سے تالا لگایا جاسکتا تھا اور کوئی بھی ملاقاتی یا سنتری جھانک کر اندر کی ہر شے کو دیکھ سکتا تھا۔ کمروں میں تازہ گرم و سرد ہوا کے داخلے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

2۔ غسل خانہ: دالان کے پار سونے کے کمرے کے بالمقابل کوٹھڑی کو غسل خانے کی صورت دیدی گئی۔ اس میں پانی کا نل بھی لگوا دیا گیا۔ غسل خانے میں لکڑی کا کموڈ' فٹ بورڈ' تولئے لٹکانے کیلئے دو ریک' دو بالٹیاں' مگ' لوٹا اور دیگر ضروری اشیاء فراہم کر دی گئیں۔ سردیوں میں پانی گرم کرنے کیلئے امرشن راڈ کے علاوہ ایک ہیٹر بھی مہیا کر دیا گیا تھا۔ صفائی کیلئے ایک خاکروب بھی متعین تھا۔

3۔ سٹور: سونے کے کمرے سے متصل کوٹھڑی کو اسٹور اور ڈریسنگ روم بنا دیا گیا تھا۔ اس کمرے میں بھٹو صاحب کے کپڑے اور دیگر اشیاء رکھی جاتی تھیں۔ اسی کمرے کو وہ بطور ڈریسنگ روم بھی استعمال

کرتے تھے اس میں ہینگرز اور الماری وغیرہ کا بھی بندوبست تھا۔

4۔ باورچی خانہ، سٹور اور ڈریسنگ روم کے بالمقابل دائیں طرف والے کمرے کو باورچی خانہ بنا دیا گیا تھا۔ یہ کمرہ صحن سے قریب ترین تھا اور دالان میں داخل ہوتے ہی دائیں طرف پہلا کمرہ تھا۔ اس میں ریفریجریٹر، تیل سے جلنے والا چولہا، ایک عدد جالی دار الماری اور دیگر اشیائے خوردونوش رکھی جاتی تھیں۔

جہاں تک سیکورٹی کا تعلق ہے بالعموم جیل کی کال کوٹھڑیاں بجلی سے محروم رکھی جاتی ہیں تاکہ پھانسی کے مجرم بجلی کے تاروں سے خودکشی کی کوشش نہ کر سکیں مگر جس سیکورٹی وارڈ میں بھٹو صاحب کو رکھا گیا تھا اس میں بجلی کا اچھا خاصا انتظام موجود تھا۔ ان کیلئے روشنی کے درج ذیل انتظامات تھے۔

1۔ ٹیبل لیمپ...... بھٹو صاحب کو پڑھنے لکھنے کی سہولت مہیا کرنے کیلئے ایک ٹیبل لیمپ دیا گیا تھا۔

2۔ پنکھا اور ہیٹر...... سونے کے کمرے میں ایک بجلی کا پنکھا چھت میں نصب تھا۔ اسی طرح سردیوں کے دوران ڈو راڈ والا ایک الیکٹرک ہیٹر بھی موجود رہتا تھا۔ نہانے کے کمرہ میں ایک امرشن راڈ اور ایک الیکٹرک ہیٹر رکھا گیا تھا۔

3۔ بجلی...... پہلے ہی ہفتے میں چھت کے پنکھے کے ریگولیٹر کی طرح بجلی کے سوئچ بھی اندر منتقل کر دیئے گئے تھے تاکہ بھٹو صاحب حسبِ منشا بجلی استعمال کر سکیں جیل کے قانون کے تحت تمام مجرموں کو ہر حالت میں بجلی یا کسی دوسری روشنی میں سونا پڑتا ہے تاکہ جیل حکام ان کی حرکات و سکنات کا ہر وقت مشاہدہ کر سکیں۔ مگر اس کے برعکس بھٹو صاحب جب چاہتے روشنی گل کر کے سو سکتے تھے۔ یہ انتظام بھٹو صاحب کی طرف سے 18 سے 26 مئی 1978ء تک کی بھوک ہڑتال کے بعد کیا گیا تھا، جس کا الگ تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔

4۔ ریفریجریٹر...... موسم گرما میں بھٹو صاحب کو ٹھنڈے مشروبات وغیرہ کی سہولت دینے کی خاطر کچن میں ایک فرج رکھ دیا گیا تھا۔ درحقیقت یہ انتظام بھٹو صاحب کی مرضی کے بجائے انتظامی سہولت کے پیشِ نظر کیا گیا تھا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ کھانے پینے کی ہر چیز بھٹو صاحب کو پیش کرنے سے پہلے جیل کے ڈاکٹر کو ایک سرٹیفکیٹ دینا ہوتا تھا کہ وہ اشیاء ان کیلئے موزوں خوراک ہیں اور زہر وغیرہ سے پاک ہیں۔ چنانچہ پانی، دودھ، گوشت، سبزی اور پھل وغیرہ کو محفوظ رکھنے کیلئے فرج کا استعمال ضروری قرار پایا تھا۔

فرنیچر اور دوسری اشیائے ضرورت۔ عام مجرموں کو لوہے کی پٹیوں والا سخت بستر دیا جاتا ہے مگر اس کے برعکس بھٹو صاحب کو ہسپتال والا اسپرنگ اور گدے دار بستر مہیا کیا گیا تھا، لیکن پھر بھی چند دنوں بعد انہوں نے شکایت کی کہ ان کے شانے اور کمر پر ورم آ گئے ہیں اور وہ اس بستر پر سو نہیں سکتے۔ آخر کار ان کے اصرار پر اس کی جگہ انہیں نوار کا پلنگ رکھنے کی اجازت دیدی گئی تھی۔ کچھ دنوں بعد بے نظیر بھٹو صاحبہ فوم کا ایک گدا لے آئیں جو تھوڑی بہت ردّ و کد کے بعد انہیں دیدیا گیا تھا۔ مزید برآں دو چھوٹی میزیں، ایک بستر کے سرہانے کی میز اور دوسری بستر کے سامنے رکھنے کی میز اور دو سیدھا بیٹھنے والی کرسیاں بھی اس کمرے میں

موجود تھیں۔ ہر چند یہ فرنیچر جیل کے قواعد و ضوابط کے خلاف تھا اور اس کی وجہ سے کمرہ بھرا بھرا نظر آنے لگا تھا مگر بھٹو صاحب کے آرام کی خاطر ان چیزوں کی سہولت مہیا کر دی گئی تھی۔

جیل میں عام مجرموں کو جوؤں اور کیڑوں سے بھرے ہوئے کمبل جیل کی طرف سے دیئے جاتے ہیں مگر بھٹو صاحب کو اپنا ذاتی بستر اور چادریں اور لینن وغیرہ استعمال کرنے کی اجازت دیدی گئی۔ علاوہ ازیں مچھروں سے بچنے کیلئے ایک عدد مچھر دانی بھی مہیا کر دی گئی تھی۔

جیل کے لباس کی بجائے بھٹو صاحب کو اپنا ذاتی لباس پہننے کی آزادی تھی عموماً وہ عوامی کرتا شلوار زیب تن کئے رکھتے اور پاؤں میں پشاوری چپل استعمال کیا کرتے تھے۔ اسی طرح جیل کے قواعد کے برخلاف انہیں شیو کرنے کے لئے بلیڈ وغیرہ رکھنے کی بھی اجازت تھی اور وہ نہانے دھونے کیلئے اپنی مرضی سے اپنا ذاتی سامان استعمال کیا کرتے تھے۔ وہ اپنی کوٹھڑی میں دوائیں وغیرہ بھی رکھ سکتے تھے لیکن ان دواؤں کی جانچ پڑتال ہوتی رہتی تھی کہ کہیں ان میں کوئی جان لیوا دوانہ ہو۔

وقتاً فوقتاً یا جب بھی ضرورت پڑے جیل کا ڈاکٹر بھٹو صاحب کے علاج کیلئے حاضر رہتا تھا۔ تاہم کسی نہ کسی وجہ سے وہ جیل کے ڈاکٹر کو پسند نہیں کرتے تھے اور دوسرے ڈاکٹروں سے علاج پر مصر رہتے تھے جن کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔ حفظانِ صحت کی خاطر بھٹو صاحب کے سیل اور اس کے ارد گرد اچھی کوالٹی کی خوشبودار کیڑے مار دوائیں باقاعدگی سے چھڑکی جاتی تھیں۔

بھٹو صاحب کو جیل کے حکام کی طرف سے روزانہ دو اخبار "پاکستان ٹائمز" اور "جنگ" مہیا کئے جاتے تھے۔ انہیں جیل میں کتابیں وصول کرنے اور رکھنے کی کھلی اجازت تھی۔ بھٹو صاحب کے افرادِ خانہ یا ملاقاتی قومی یا بین الاقوامی رسائل و جرائد جس قدر چاہتے ہمراہ لاتے اور بھٹو صاحب کو بے روک ٹوک دیا کرتے تھے۔ تام بعض موقعوں پر تلاشی لینے کا عمل ملاقاتیوں کیلئے مشکل اور ناگوار صورتحال پیدا کر دیا کرتا تھا جس کا ذکر کتاب میں کسی اور جگہ آئے گا۔

روزمرہ معمولات۔ اگرچہ بھٹو صاحب کی سی شخصیت سے روزمرہ معمولات میں باقاعدگی کی توقع نہیں کی جا سکتی مگر ایک تنگ کمرے میں اسیری کے باعث ان کے روزانہ کے معمولات معین ہو گئے تھے اور پنڈی جیل میں اپنے گیارہ مہینوں کے قیام کے دوران وہ ان معمولات کے پابند ہو گئے تھے۔ وہ رات دیر تک جاگتے رہتے اور دن چڑھے سو کر اٹھتے تھے۔ موسم گرما میں وہ عموماً آٹھ بجے صبح کو بیدار ہوتے اور موسم سرما میں نو' ساڑھے نو بجے جاگتے تھے۔ چائے کی ایک پیالی پینے کے بعد وہ شیونگ کٹ طلب کرتے۔ ان دنوں کو چھوڑ کر جب وہ احتجاج پر ہوتے تو وہ بڑی باقاعدگی اور نفاست کے ساتھ ہر روز شیو کرتے تھے۔ میں نے آج تک بھٹو صاحب کی طرح مکمل اور صاف ستھری شیو کرنے والے آدمی کم ہی دیکھے ہیں۔ بعد ازاں وہ کچھ وقت غسل خانے میں گزارتے اور اپنے بدن کی صفائی وغیرہ کا خاص خیال رکھتے تھے۔ وہ ہر مرتبہ نفیس آفٹر شیو لوشن After shave Lotion اور کولون وغیرہ استعمال کیا کرتے تھے۔ چارلی کولون اور شالیمار (Charlie Cologne & Shalimar)

ان کے پسندیدہ ترین عطریات میں سے تھے۔ وہ بالعموم گہرے رنگوں کے شلوار کرُتے میں ملبوس رہنا پسند کرتے تھے اور سیاہ رنگ کے ہلکے پشاوری چپل پہنتے تھے۔ سردیوں میں سینٹ مائیکل کی ہلکی بادامی رنگ کی جرسی ہی پہنا کرتے تھے۔ غسل کرنے کے بعد وہ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے ناشتہ کیا کرتے تھے۔ بھٹو صاحب عموماً بہت کم خور شخص تھے۔ عام طور پر ان کا ناشتہ ڈبل روٹی کے ایک یا دو ٹکڑوں پر مشتمل ہوتا تھا' جن پر مکھن شاذ و نادر اور کبھی کبھار ہلکا سا جام لگایا جاتا تھا۔ بس یہ دو لقمے اور کافی یا چائے کی پیالی۔ البتہ وہ کبھی کبھار صرف ایک آدھ ابلا ہوا انڈہ بھی کھا لیا کرتے تھے۔ کئی دفعہ تو وہ صرف چائے یا کافی کے ساتھ ایک آدھ بسکٹ ہی پر اکتفا کر لیتے تھے۔ یہ تھا ان کا ناشتہ!

ناشتہ کے بعد وہ اس دفتری قسم کی کرسی پر بیٹھ جاتے جو انہیں مہیا کی گئی تھی اور اخبارات کا مطالعہ کرنے لگتے تھے۔ وہ اخبارات کو الف سے ی تک تفصیلاً پڑھا کرتے تھے۔ میں آج تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ بھٹو صاحب جیسا آدمی اتنا وقت صرف ایک انگریزی اور ایک اردو اخبار پر کیسے صرف کر دیتا تھا۔ ان کی بیگم اور بیٹی ان کیلئے ٹائم' نیوز ویک اور دوسرے رسائل و جرائد لایا کرتی تھیں۔ میں ان کے مطالعہ کی عادت پر حیران ہوتا تھا کہ وہ بڑے انہماک کے ساتھ پڑھنے میں مصروف رہتے تھے۔ وقتاً فوقتاً وہ مطالعہ کے دوران چائے یا کافی کا ایک آدھ پیالہ طلب کرتے تھے۔ کبھی کبھی تو وہ دوپہر کا کھانا سرے سے کھایا ہی نہیں کرتے تھے اور اس کے بدلے صرف چائے یا کافی اور ایک دو بسکٹ پر گزارہ کر لیتے تھے۔

وہ عموماً دوپہر کا کھانا دو تین بجے کھایا کرتے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ بستر پر دراز ہو کر سگار پیتے اور جاگتے رہتے۔ انہیں دوپہر کے وقت سونے کی عادت بالکل نہیں تھی۔ اس طرح لیٹے لیٹے وہ کتابوں اور رسالوں کے مطالعے میں محو رہتے یہاں تک کہ ان کے وکلاء آ جاتے۔ وکلاء نے سپریم کورٹ سے بھٹو صاحب کے ساتھ بحث و تمحیص کیلئے صحن میں بیٹھنے کی اجازت لے رکھی تھی۔ وکلاء کا نقطہ نظر یہ تھا کہ بھٹو صاحب کی کوٹھڑی میں گفتگو کو ٹیپ کرنے کے آلات پوشیدہ طور پر نصب ہیں اور ایسے آلات کی موجودگی میں وہ مقدمہ کے قانونی پہلوؤں پر گفتگو نہیں کرنا چاہتے۔ سپریم کورٹ نے وکلاء کے اندیشوں کے پیش نظر انہیں باہر صحن میں بیٹھ کر گفتگو کی اجازت دیدی تھی۔ یوں بھی وہ شام کو ٹہلائی کیلئے نکلتے تھے اسلئے اپنے وکلاء کے ساتھ بھی صحن میں بات چیت کرتے تھے۔ اس بات چیت کے دوران چائے کے ایک دو دَور ضرور چلتے۔ غروب آفتاب کے بعد انہیں کوٹھڑی میں آنا پڑتا جہاں وہ یا تو پڑھنے میں اپنا وقت گزارتے یا لکھنے میں یا مقدمہ کے نکات پر غور و فکر میں۔ جنوری 1979ء کے بعد اس معمول میں خصوصیت کے ساتھ زیادہ باقاعدگی پیدا ہو گئی تھی۔ رات کا کھانا وہ ذرا دیر سے عموماً 9 سے 10 بجے کے درمیان کھاتے اور بارہ بجے رات یا اس کے بعد سوتے۔

بھٹو صاحب کے پسندیدہ کھانوں کی تفصیل یہ ہے۔

قیمہ وہ سب سے زیادہ پسند کرتے تھے۔ مرغ کا شوربا یا بھنا ہوا مرغ۔ دال مسور' دال چنا' آلو قیمہ' مرغ کی یخنی' دال لوبیہ' بھنڈی' کریلا گوشت' بینگن اور کباب۔ گرمیوں میں بعد دوپہر چاکلیٹ ڈرنک لیتے یا

آئس کریم کھاتے۔ آموں کے موسم میں وہ بعد دوپہر دو ایک آم کھایا کرتے۔ وہ چپاتی کے شوقین تھے اور چاول کبھی کبھار ہی کھایا کرتے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ دوپہر کے کھانے کے ساتھ پھل وغیرہ نہ کھاتے اور رات کے کھانے میں میٹھا نہیں لیتے تھے۔ ہاں وہ نان کو چپاتی پر ترجیح دیتے تھے۔ ایک ایسے قیدی کو جو کھانے تیار کرنے میں مہارت رکھتا تھا بطور مشقتی بھٹو صاحب کی خدمت میں دیدیا گیا تھا۔ کھانے پینے کی تمام چیزوں کی پہلے جیل ڈاکٹر تصدیق کرتا اور پھر انہیں باورچی خانہ کے فرج میں رکھا جاتا۔ شروع شروع میں از راہِ احتیاط باہر سے کھانے پینے کی چیزیں لانے کی اجازت نہ تھی۔ کچھ عرصہ بعد بیگم بھٹو کراچی سے اسلام آباد آگئیں اور پراچہ ہاؤس میں مقیم ہوئیں تب بھٹو صاحب کیلئے اس گھر سے کھانا آنے لگا۔

جیل قوانین کے مطابق ایک قیدی جسے پھانسی کی سزا سنائی جاچکی ہو وہ صرف جیل کے کھانے کو بہتر کرنے کیلئے فالتو پیسے دے سکتا ہے لیکن باہر سے پکا پکایا کھانا نہیں منگوا سکتا مگر بھٹو صاحب کو اس معاملے میں حکام نے خاص رعایت دے رکھی تھی۔ دوپہر کا کھانا تقریباً بارہ بجے دن جیل سپرنٹنڈنٹ کے دفتر پہنچ جاتا۔ سپرنٹنڈنٹ پہلے اس میں سے خود ٹسٹ کرتے پھر ڈاکٹر کو بلایا جاتا جو آزمائشی نوالہ لیتا اور اس کے بعد بھٹو صاحب کے سیل میں بھیجا جاتا۔ کھانا اتنا زیادہ ہوتا کہ بھٹو صاحب کے بعد مشقتی اور پھر خاک روب بھی پیٹ بھر کر کھایا کرتے تھے۔ شام کا کھانا ڈپٹی یا اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کے سامنے سے ہوتا ہوا بھٹو صاحب کو پہنچتا۔ دراصل جیل میں کسی بھی قیدی کے کھانے وغیرہ کی کوئی بھی چیز پہلے جیل حکام سے ہو کر باقی بچی کھچی اس تک جاتی ہے۔ بیگم بھٹو صاحبہ اس بات کا اہتمام ضروری کرتی تھیں کہ کھانے میں کم از کم ایک ڈش بھٹو صاحب کے مرغوب کھانے کی ضرور ہو۔ بھٹو صاحب سگار ہی پیتے تھے اور ان کے سیل میں ہوانا سگار کا اچھا خاصا سٹاک رہتا تھا۔ وہ عموماً سگار باہر نکل کر پیا کرتے تھے تاکہ تنگ سیل میں سگار کا دھواں ان کی آنکھوں کو متاثر نہ کرے۔

سیکورٹی وارڈ میں ٹھنڈے مشروبات کا اچھا خاصا ذخیرہ ہر وقت موجود رہتا تھا۔ مگر بھٹو صاحب کا دل پسند مشروب صرف پیپسی کولا تھا۔ وہ جب بھی مشروب کیلئے کہتے ہمیشہ پیپسی کولا ہی نوش کرنا پسند کرتے۔ ایک دو دفعہ ان کیلئے نواب شاہ سے ایک 'ایک کریٹ شاید تھادِل شربت بھیجا گیا۔ اسے وہ گرمیوں میں شوق سے پیا کرتے تھے۔ جب رپورٹ میں ایک کریٹ بوتل کا ذکر ہوا تو مجھ سے حکام بالا نے خاص طور پر پوچھا کہ ان بوتلوں میں کیا چیز تھی؟ ان کو جواب میں بتایا گیا کہ یہ تھادِل شربت کی بوتلیں تھیں اور ان میں کوئی نوتل شراب وغیرہ کی نہیں تھی۔

بھٹو صاحب کی پہلی بھوک ہڑتال

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ 17 مئی 1978ء کو جونہی بھٹو صاحب کو جیل میں قیدی گاڑی سے اتار کر سیدھا سیکورٹی وارڈ میں لے جایا گیا' یہ وارڈ دفاعی کانٹے دار تاروں' سنتریوں کی پوسٹوں' در جگہ جگہ تالے کنڈیوں اور وارڈروں سے بھرپور تھی اور پھر فوجی فیلڈ ٹیلیفون' الارم کی گھنٹیاں اور اپنے سیل کے

دروازے پر دالان میں جیل وارڈر کو اپنے سامنے سنتری پایا' تو انہوں نے صبح دس بجے کے قریب جیل سپرنٹنڈنٹ کو سیکورٹی وارڈ میں بلوایا اور مندرجہ ذیل اعتراضات کیے۔

ا۔ فوجی ٹیلیفون دالان میں کیوں رکھا گیا ہے۔ ان کے خیال میں شاید اس ٹیلیفون میں کسی قسم کے خاص آلات رکھے گئے تھے۔ انہوں نے چاہا کہ اس ٹیلیفون کو وہاں سے فوراً باہر نکال دیا جائے۔ دراصل یہ ٹیلیفون آپریشن روم اور سیکورٹی وارڈ میں بات چیت کرنے کیلئے نصب کیا گیا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر ڈیوٹی افسر سیکورٹی وارڈ میں جیل کے ڈپٹی اسسٹنٹ سیکورٹی سپرنٹنڈنٹ یا ہیڈ وارڈر سے وہاں کا حال احوال لے سکے۔

ب۔ ان کا دوسرا اعتراض جیل وارڈر کے ان کی کوٹھڑی کے پاس دالان میں کھڑا ہونے پر تھا۔ انہوں نے کہا کہ اوّل تو سنتری کی کوئی ضرورت ہی نہیں اور اگر اس کا ہونا ضروری ہے تو اسے باہر صحن میں کھڑا ہونا چاہئے۔

ج۔ بجلی اور پنکھے کے سوئچ اور ریگولیٹر وغیرہ کوٹھڑی کے اندر کے بجائے باہر دالان میں نصب تھے تاکہ بجلی کے تاروں سے قیدی خودکشی نہ کر سکے۔ انہوں نے کہا کہ یہ سوئچ وغیرہ ان کی کوٹھڑی میں ہونے چاہئیں تاکہ وہ اپنی مرضی سے ان کو آن/ آف (On\Off) کر سکیں۔

د۔ بھٹو صاحب کی کوٹھڑی کے سامنے والا کمرہ ان کے غسل خانے کے طور پر رکھا گیا تھا۔ اس کے دروازے پر قیدیوں کے لباس والے کھدر کا پردہ لٹکایا گیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ یا تو صحیح دروازہ ہونا چاہئے یا کم از کم چھت پر گہرے رنگ کا کپڑا لگا کر لٹکانا چاہئے تاکہ غسل خانے میں پردے کا پورا بندوبست ہو۔

ر۔ سیکورٹی وارڈ پر جیل کی گارد مقرر تھی جو اندر ہی ایک فاضل کوٹھڑی میں رکھی گئی تھی۔ بھٹو صاحب نے اس گارد کے اندر ہونے پر اعتراض کیا اور کہا کہ یہ لوگ میرے آرام میں خلل انداز ہوتے ہیں اس لیئے انہیں وارڈ کے اندر نہیں ہونا چاہئے۔

بھٹو صاحب نے جیل سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ ان کے ان اعتراضات کو فوراً دُور کیا جانا چاہئے۔ 17 مئی 1978ء کو بھٹو صاحب نے دوپہر اور شام کا ہلکا سا کھانا تناول کیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے اعتراضات پر کوئی ردِّ عمل نہیں ہوا تو انہوں نے 18 مئی کی صبح سے بھوک ہڑتال کر دی۔ ادھر مارشل لاء حکّام نے کوئی اعتراض قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ نے کافی منت سماجت کی مگر بھٹو صاحب نے کچھ کھانے سے انکار کر دیا۔ مسٹر دوست محمد اعوان' بھٹو صاحب کے پہلے وکیل تھے جو 19 مئی 1978ء کی دوپہر کو ان سے ملنے جیل میں آئے۔ پھر 20 مئی کو یحیٰی بختیار اور غلام علی میمن بھی ان سے آ کر ملے۔ ان وکلاء نے سپریم کورٹ میں جا کر کافی شور کیا' جس پر سپریم کورٹ نے جیل حکام سے کہا کہ سیکورٹی کو مدِّنظر رکھتے ہوئے بھٹو صاحب کے اعتراضات کا خیال رکھا جائے۔ 22 مئی کو مارشل لاء حکام نے اجازت دیدی کہ فیلڈ ٹیلیفون کو دالان سے باہر صحن میں گارد کیلئے خیمہ لگا کر اس میں رکھ دیا جائے۔ غسل خانے کے دروازے پر پردے کا پورا انتظام کر دیا جائے۔ جیل کے سنتری کو بھٹو

صاحب کے سیل کے دروازے سے ہٹا کر کچھ فاصلے پر دالان میں ہی رکھا جائے اور چونکہ بھٹو صاحب کی اپیل سپریم کورٹ میں زیر بحث تھی اس لئے ان کی خُود کُشی کا امکان کم تھا اسلئے جب تک اپیل کا فیصلہ نہیں ہوتا بجلی کے سوئچ اور ریگولیٹر وغیرہ دالان سے ان کے کمرے میں منتقل کر دیئے جائیں۔ دن کیلئے گارد کو وارڈ کے اندر سے باہر ٹینٹ میں منتقل کر دیا جائے مگر رات کو وارڈ کے اندر ہی رکھا جائے۔ بھٹو صاحب نے تمام اعتراضات قبول ہو جانے پر 22 مئی 1978ء کی شام کو اپنی بھوک ہڑتال ختم کر دی اور شام کا کھانا تناول کیا۔ یوں یہ نازک معاملہ اختتام پذیر ہوا۔ بہرحال انہوں نے پانچ دن بھوک ہڑتال کر کے حکام کو یہ بتا دیا کہ ان میں قوتِ برداشت اور اپنے موقف پر ڈٹے رہنے کی کتنی طاقت' صلاحیت اور جرأت ہے اور وہ کس حد تک تکالیف برداشت کر سکتے ہیں۔

ابتدائی ایام

جونہی بھٹو صاحب کو سنٹرل جیل راولپنڈی منتقل کرنے کا فیصلہ ہوا اس وقت جیل میں بہت سے ایسے لوگ بھی قید تھے جو پاکستان پیپلز پارٹی سے تعلق رکھتے تھے یا انہیں مارشل لاء حکام نے ان کی معمولی کوتاہیوں پر سزا دیدی تھی۔ ایسے سب قیدیوں کی فہرستیں تیار کی گئیں اور انہیں پنڈی سے باہر دوسری ضلعی جیلوں میں منتقل کر دیا گیا تاکہ مسٹر بھٹو کی اسیری کے دوران کوئی گڑبڑ یا بلوہ وغیرہ نہ ہو۔ حکام نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ جب تک مسٹر بھٹو کو راولپنڈی جیل میں رکھا جائے کوئی قیدی جس کا پی پی پی سے تعلق ہو اس جیل میں نہ لایا جائے۔ اس فیصلہ پر پنڈی جیل کے حکام بہت خوش تھے کہ ان کی جیل کو صاف کر دیا گیا ہے۔

ملاقاتی۔ بھٹو صاحب سے ہر خاص و عام کو ملنے کی اجازت نہ تھی۔ ان سے ملنے کیلئے سپریم کورٹ یا حکومت پنجاب کے ہوم سیکرٹری کا اجازت نامہ ہونا ضروری تھا۔ سپریم کورٹ ایسا کوئی بھی حکم سپرنٹنڈنٹ جیل راولپنڈی کو بھیجتا جو ایسے احکامات پر عمل کرنے سے پہلے مجھے اور ایس ایم ایل اے کو اطلاع کرتا اور اگر ضرورت سمجھی جاتی تو عمل سے پہلے ایس ایم ایل اے حکام بالا سے مشورہ کر لیا کرتے تھے۔ حکومت کا ہوم ڈیپارٹمنٹ جب بھی کوئی اجازت نامہ یا حکم جیل سپرنٹنڈنٹ کو بھیجتا اس کی نقل مجھے بھی دی جاتی اور ایس ایم ایل اے اور ڈی ایم ایل اے کو الگ الگ اطلاع کر دی جاتی اور عمل در آمد سے پہلے مجھے ان حکام سے اجازت لینی ہوتی تھی۔ ابتدائی ایام میں مندرجہ ذیل ملاقاتیوں کا آنا جانا رہا۔

ا۔ وکلاء...... بھٹو صاحب کے اس کیس کی یحیٰ بختیار، دوست محمد اعوان، غلام علی میمن، عبدالحفیظ لاکھو اور آخری دنوں میں عبدالحفیظ پیرزادہ نے بھی پیروی کی۔ سپریم کورٹ نے ایک وقت میں صرف دو وکلاء کو بھٹو صاحب سے روزانہ ایک گھنٹہ ملنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ جمعہ اور تعطیلات کے دنوں میں وکلاء جیل میں نہیں آسکتے تھے۔ شروع شروع میں وکلاء کو دن کے دو سے تین بجے تک جیل میں آنے کی اجازت تھی لیکن بعد میں شام چھ سے آٹھ بجے کے دوران صرف ایک گھنٹہ کیلئے باہر صحن میں بیٹھ کر بھٹو صاحب سے ملنے کی اجازت ہو گئی تھی۔ بھٹو صاحب سے تمام ملنے والے ملاقاتیوں کی تفصیل ضمیمہ نمبر 1 میں دی گئی ہے۔

ب۔ بیگم و بیٹی...... عام حالت میں پھانسی کے سزا یافتہ قیدی کے ملاقاتیوں کو جیل حکام کی مرضی پر چند منٹ ملاقات کی اجازت دی جاتی ہے اور ایسی ملاقات قانونی طور پر بیس منٹ تک ہو سکتی ہے۔ بیگم بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کو ہفتہ میں الگ الگ ایک مرتبہ ملاقات کی اجازت تھی۔ یہ دونوں بیگمات کراچی سے پولیس کے ایک افسر کی نگرانی میں ہوائی جہاز سے راولپنڈی لائی جاتی تھیں اور ملاقات کے فوراً بعد اگلی فلائٹ سے واپس کراچی لے جائی جاتی تھیں۔ بیگم نصرت بھٹو پہلی مرتبہ 21 مئی 1978ء صبح ساڑھے نو بجے جیل میں ملاقات کیلئے لائی گئیں۔ ان کی یہ ملاقات بھٹو صاحب کی کوٹھڑی میں کرائی گئی جو بارہ بج کر 35 منٹ تک جاری رہی۔ اس ملاقات سے ایک دن پہلے ایس ایم ایل اے بریگیڈیئر ایم ممتاز ملک نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کیا۔ وہ ایک دانشور قسم کے بہت ہی شریف اور نیک دل انسان ہیں۔ وہ اپنے کام میں ماہر اور کامل شخص ہیں۔ مجھے ان جیسے بہت کم کمانڈروں کے تحت کام کرنے کا موقع ملا ہے۔ انہوں نے اس دن مجھے بتایا کہ ہمیں بہت سخت کام سونپا گیا ہے۔ ایک طرف ہمارے ملک کے سابق سربراہ ہیں جنہیں بدقسمتی سے ایک مقدمے کے سلسلے میں قید کر لیا گیا ہے اور دوسری جانب موجودہ حکمران ہیں جن کو ہم نے پوری ایمانداری سے وفاداری دکھانی ہے جس کی ہم نے قسم کھا رکھی ہے۔ ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ بھٹو صاحب کا کیس سچا ہے یا جھوٹا۔ یہ کام تو سپریم کورٹ کا ہے۔ ہمیں تو جو ڈیوٹی دی گئی ہے اسے پورا کرنا ہے۔ لیکن مجھے انہوں نے نصیحت کی کہ اس ذمہ داری کو نبھانے میں مجھے غیر جانبدار، ثابت قدم مگر دوستدار رہنا ہو گا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اگلے دن بیگم بھٹو صاحبہ مسٹر بھٹو سے ملنے آرہی ہیں اور اس کے بعد ان کے باقی رشتہ دار بھی آتے رہیں گے۔ بھٹو صاحب اور ان کے رشتہ داروں سے قانون کے اندر رہ کر عزت سے پیش آنا چاہئے۔ میں جناب ایم ممتاز ملک کا ایسی نصیحت کیلئے تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

دوسرے دن بیگم بھٹو کی ملاقات سے پہلے میں نے جیل سپرنٹنڈنٹ سے ایسی ملاقاتوں کے بارے میں مفصل بات چیت کی۔ میں نے انہیں بتایا کہ ملاقات بھٹو صاحب کی کوٹھڑی کے اندر ہوا کرے گی۔ چونکہ وقت کی کوئی کمی نہیں اس لئے 20 یا 30 منٹ کی بندش نہیں ہوگی۔ اگر ملاقاتی بہت زیادہ وقت لے لیتا

ہے تو یاد دہانی کرائی جاسکتی ہے۔ ملاقات کے دوران بھٹو صاحب کو ہر طرح کی خلوت مہیا کی جائے گی۔ وارڈر جوان کی کوٹھڑی کے دروازے سے ہٹ کر نزدیک دالان میں کھڑا ہوتا ہے' وہ دالان سے باہر چلا جایا کرے گا تاکہ ملاقات کے دوران کسی قسم کی خلل اندازی نہ ہو۔ میری ان ہدایات پر جیل سپرنٹنڈنٹ کافی خوش ہوا اور بعد میں کہنے لگا کہ اس کو ڈر تھا کہ مارشل لاء حکام کہیں وقت کی پابندی کے علاوہ دوسری پابندیاں بھی عائد نہ کر دیں۔

ابتدائی ایام میں مختلف عناصر کا رویّہ

جیل میں ڈیوٹی کے دوران مجھے ایسا انوکھا تجربہ ہوا جو پہلے کبھی سوچا تک نہ تھا۔ بھٹو صاحب جیسا ایک عظیم لیڈر جیل کی کوٹھڑی میں ایک بپھرا ہوا شیر بنا بیٹھا تھا۔ مارشل لاء تو تمام قاعدوں اور قوانین سے بالاتر ہوتا ہے۔ جیل حکام ہر ایک کو یس سر (Yes Sir) کر رہے تھے' بیگمات حالات سے سمجھوتہ کرنے کے موڈ میں نظر نہ آ رہی تھیں اور میرے جیسا سپاہی' جس کیلئے فرض کی ادائیگی ایمان کا جزہو' ان ناموافق حالات میں گھرا ہوا تھا۔ یہ تھے وہ متضاد حالات جن کی کچھ تفصیل ذیل میں درج ہے۔

شروع شروع کے ایام میں بھٹو صاحب کا رویّہ

پنڈی جیل میں آمد پر پہلے ہی دن صبح سویرے جب بھٹو صاحب' سپرنٹنڈنٹ جیل راولپنڈی اور سپرنٹنڈنٹ جیل کوٹ لکھپت لاہور' سیکورٹی وارڈ کے صحن میں بیٹھ کر چائے نوش کر رہے تھے تو صحن ہی میں ڈیوٹی پر اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے ایک کرسی لی اور صحن کے کونے میں لے جا کر اس پر بیٹھ گیا۔ بھٹو صاحب کو اس غریب کا اپنے سامنے بیٹھنا پسند نہ آیا اور اس کو خوب جھاڑ پلائی اور اسے کہا کہ تمہیں کس نے اجازت دی ہے کہ تم ہمارے سامنے کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ خبردار اگر کبھی پھر ایسی حرکت کی۔ انہی دنوں میں اگر انہوں نے کسی وارڈر کو ڈیوٹی پر دیکھا تو اس پر بھی برس پڑے۔ اس طرح وہ نہ چاہتے تھے کہ ان کی کوٹھڑی پر رات کے وقت تالا لگایا جائے تاکہ وہ جس وقت چاہیں باتھ روم جاسکیں۔ ان کے اس رویئے سے جیل کا ہر شخص ان سے دُور بھاگنے کی کوشش کرنے لگا۔ انہوں نے آتے ہی بھوک ہڑتال کر دی۔ سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے ان کی کافی منت سماجت کی کہ وہ بھوک ہڑتال ختم کر دیں مگر انہوں نے اس وقت تک کھانا نہ کھایا جب تک کہ ان کے مطالبات پورے نہ کر دیئے گئے۔ انہوں نے جیل حکام سے بھوک ہڑتال والے دنوں میں کافی سخت اور ناراضگی کا رویّہ روا رکھا۔

مارشل لاء حکام۔ دوسری طرف مارشل لاء حکام نے بھٹو صاحب کو قابو میں رکھنے کیلئے حفاظتی انتظامات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی جس کا کچھ بیان میں پہلے کر چکا ہوں۔ ان کی اسیری کے دوران نت نئے خیالات جنم لیتے رہے اور ہر روز نت نئی حفاظتی تدابیر عمل میں لائی جاتی رہیں۔ جن کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔ مارشل لاء حکام نے بڑی احتیاط کے ساتھ جیل کے ہر فرد کیلئے احکامات جاری کیے۔ اسی طرح

پولیس اور فوج کیلئے بھی واضح ہدایات جاری کی گئیں تاکہ بھٹو صاحب کے فرار کے سلسلے میں پیپلز پارٹی کی کوئی تدبیر کامیاب نہ ہوسکے۔ دراصل حکومت ان کے ساتھ پھانسی کی سزا کے مجرم کا سلوک روا رکھنا چاہتی تھی لیکن ان کے متعلق بے حد متفکر ہونے کے باعث ضرورت سے کہیں زیادہ حفاظتی انتظامات کر رہی تھی۔

جیل حکام۔ جیل حکام کو اس قدر تفصیلی احکامات کے باوجود میں نے اپنی سروس میں اتنی غیر ذمہ داری اور ڈھیلے پن کا مظاہرہ کہیں نہیں دیکھا جو جیل کے اندر واقع ہوا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ جیل کے اندر مکمل اختیار ہی نہیں رکھتا بلکہ عملاً مطلق العنان کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈپٹی اور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ بھی بڑی شے ہوتے ہیں۔ تمام وارڈر جیل کی مضبوط اور اونچی چار دیواری میں اپنے آپ کو ہر لحاظ سے محفوظ اور ہر طرح سے قلعہ بند تصوّر کرتے ہیں۔ اگر کسی بھی قیدی کا طور طریقہ جیل کے حکام کو پسند نہ آئے تو اس کی ایسی مالش کر دی جاتی ہے کہ وہ اپنی بقیہ قید کے دوران کسی غلطی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ دراصل جیل کی دیواریں اتنی موٹی اور بلند ہوتی ہیں کہ اندر کی کوئی آواز باہر سنائی نہیں دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے بدمعاش اور غنڈے اپنی قید کے دوران شریف اور نیک انسان بن جاتے ہیں اور ان کی بدمعاشی والی رگ صرف ان کی رہائی کے بعد ہی پھڑک سکتی ہے۔ جیل کے ساتھ تعلق کے ایک سال کے دوران میں نے مشاہدہ کیا ہے کہ جیل میں حفاظتی انتظامات بے حد لاپروائی سے چلائے جاتے ہیں اور اگر کوئی قیدی جیل سے فرار کی کوشش کرے تو یہ کام ہمارے جیل حکام کی لاپروائی کی وجہ سے زیادہ مشکل نہیں تھا۔

بھٹو صاحب کی اسیری کے دوران مارشل لاء حکام کے حفاظتی انتظامات اور طریقۂ کار فوجی طور طریقوں سے بھی زیادہ سخت اور ہوشیاری سے بنائے گئے تھے۔ جیل سپرنٹنڈنٹ تو جیل کا گورنر ہوتا ہے۔ اسے تالوں کی چابیاں خود اٹھانے اور ان تالوں کو خود کھولنے کا خیال کیسے آسکتا ہے جبکہ درجنوں وارڈر اس کے آگے اور پیچھے چلنے کیلئے موجود ہوں۔ مگر مارشل لاء حکام کے احکامات کے مطابق جب کبھی سپرنٹنڈنٹ یا ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کو سیکورٹی وارڈ میں خود اکیلے یا کسی بالا آفیسر کے ساتھ جانا ہوتا تو تمام تالوں کی چابیاں وہ خود اٹھاتا۔ خود ہی تمام تالوں کو کھولتا اور خود ہی بند کرتا۔

جیل میں ایک وارڈر چار گھنٹے لگاتار ڈیوٹی دیتا ہے۔ اتنی لمبی مدت میں ایک جوان کبھی بھی ضرورت کے مطابق ہوشیار نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک وارڈر اپنی ڈیوٹی کے دوران بیٹھا ہو یا اونگھ رہا ہو تو اس کی ڈیوٹی میں کوئی خلل تصور نہیں کیا جاتا۔ اس کے برخلاف فوج میں ایک جوان اپنی دو گھنٹے کی ڈیوٹی کے دوران بیٹھ تک نہیں سکتا۔ دوسری طرف جب بھی جیل حکام سے مارشل لاء احکامات کی سختی سے پابندی کرنے کو کہا گیا تو ہر دفعہ یہی جواب ملا کہ جناب بھٹو صاحب جلد یا بدیر رہا ہو جائیں گے اور پھر انہیں دوبارہ حکومت میں آنے میں کچھ وقت نہ لگے گا۔ ان کی یہی استدعا ہوتی تھی کہ مارشل لاء حکام ان کی نوکری کو کیوں ختم کرانا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جیل کا ہر فرد بھٹو صاحب پر ڈیوٹی کو پوری پابندی کے ساتھ دینے کو تیار اور

سنجیدہ نہ تھا۔ بہرحال حکام بالا کے باربار معائنہ اور تنبیہ پر جیل حکام نے کسی حد تک اپنے رویئے میں کچھ تبدیلی کر ہی لی لیکن ان پر پورا بھروسا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چونکہ ڈیوٹی افسر کی نگاہ تقریباً ہر جگہ پہنچ جاتی تھی اور ڈیوڑھی کے اوپر والے فوجی سنتری بھی سیکورٹی وارڈ میں ہر جنبش کو بخوبی دیکھ اور سن سکتے تھے، پھر انٹیلی جنس کا نظام بھی اندرونی حالات سے آگاہی رکھتا تھا اسلئے جیل حکام کسی چیز کو زیادہ دیر تک چھپا کر نہ رکھ سکتے تھے اور ان کو اپنی غلطی یا لاپروائی کا جواب دینا پڑتا تھا اسلئے انہیں چار و ناچار کام کو درست طریقے سے کرنا ہی پڑتا تھا۔

شروع کے دنوں میں ہی جیل سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے بھٹو صاحب کے معلوم کرنے پر یا اپنی طرف سے ان کو بتا دیا تھا کہ ان کا کمرہ بگڈ (Buggea) ہے۔ وہ بھٹو صاحب کو اشارے سے دالان میں بلا کر ان سے بات چیت کیا کرتے تھے۔ انہی دنوں میں یہ حضرات بھٹو صاحب کو کچھ زیادہ ہی خوش کرنے کی کوشش میں تھے اور جب بھی بھٹو صاحب نے کسی چیز پر اعتراض کیا تو انہوں نے سب قصور کرنل انچارج پر تھوپ دیا۔ شاید بھٹو صاحب کے پوچھنے پر انہوں نے میرا نام کرنل امجد بتایا اور کہا کہ یہ شخص سخت سرپھرا ہے اور ان کے سخت مخالفوں میں سے ہے۔ یہی وجہ تھی کہ شروع شروع کے ایّام میں بھٹو صاحب کے وکلاء نے ان کے بیان کا حوالہ دے کر پریس میں یہ بیان دیا تھا کہ دراصل جیل سپرنٹنڈنٹ یار محمد نہیں بلکہ کرنل امجد ہے جو مارشل لاء کی طرف سے جیل کے تمام کاروبار کو چلا رہا ہے۔ چند ہفتوں میں جونہی میں نے سیکورٹی وارڈ جا کر بھٹو صاحب سے خود ملنا شروع کیا تو ایک دو ملاقاتوں میں ہی بھٹو صاحب جیسے زیرک انسان نے مجھے اچھی طرح پرکھ لیا اور بھٹو صاحب کا جیل سپرنٹنڈنٹ سے اعتبار اٹھ گیا۔ کچھ مدت بعد ایک دفعہ جب جیل سپرنٹنڈنٹ سیکورٹی وارڈ میں ان سے ملنے گئے تو بھٹو صاحب نے ان کو دیکھ کر کہا "یہ رنجیت سنگھ کی اولاد آرہی ہے"۔ ان ریمارکس کو جیل سپرنٹنڈنٹ نے اپنے کانوں سے سنا تھا بلکہ ان کے ساتھ وارڈروں اور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے بھی سنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس دن سے ان کا بھٹو صاحب کے متعلق رویّہ بالکل بدل گیا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے بعد انہوں نے سیکورٹی وارڈ جانا ہی چھوڑ دیا اور جب تک انہیں بھٹو صاحب نے کہہ کر نہ بلایا ہو، وہ خود آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ جب میں نے بھٹو صاحب سے ملنا شروع کر دیا اور ہم بہت حد تک بے تکلف ہو گئے تو انہوں نے جیل حکام کے قصّے مجھے سنائے جو وہ شروع شروع کے ایّام میں میرے متعلق ان کو سنایا کرتے تھے۔ جن کا ذکر میں اس کتاب کے اگلے صفحات میں کروں گا۔

بیگمات کا رویّہ۔ جن اونچائیوں سے مسٹر بھٹو اور ان کے خاندان کو نیچے گرایا گیا اور یہی نہیں بلکہ ان پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے گئے ایسے حالات میں ماں اور بیٹی سے کیا رویّہ اختیار کرنے کی امید کی جا سکتی تھی۔ کچھ ہی عرصہ پہلے جن کی خاطر ہر مجلس و موقع پر ہر خاص و عام اپنی آنکھیں بچھانے کیلئے تیار تھا، آج ان کے لئے ایک عام قیدی کے رشتہ داروں جیسا برتاؤ کرنا کیسے ممکن تھا؟ محترمہ بے نظیر بھٹو جب بھی جیل میں

آتیں، خاموشی متانت اور وقار کے ساتھ آتیں اور اسی طرح بھٹو صاحب کی کوٹھڑی میں جا کر ان سے ملاقات کرتیں۔ صرف دوسری یا تیسری ملاقات کے بعد وہ جیل سپرنٹنڈنٹ کے دفتر آئیں اور انہوں نے کہا کہ چیئرمین صاحب کی ملاقات کے دوران مداخلت (Disturbance) نہ کی جائے۔ دراصل اس وقت کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے کافی وقت گزر جانے کے بعد یاددہانی کیلئے کوٹھڑی کے اندر جھانکا تو اس حرکت پر انہوں نے برُا محسوس کیا۔ بیگم بھٹو صاحبہ جب بھی جیل میں بھٹو صاحب سے ملاقات کیلئے آتیں، وہ کافی ٹھاٹ باٹ کے ساتھ کار سے باہر آتیں اور بڑے باوقار طریقے کے ساتھ چلتیں۔ وہ یہ چاہتیں کہ ہر سنتری ان کیلئے بغیر رُکے دروازے کھولتا چلا جائے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کے رویئے میں کافی تبدیلی آتی گئی خاص طور پر اس ناگوار واقعہ کے بعد جس میں انہوں نے اپنے سامان کی تلاشی دینے سے انکار کر دیا تھا اور بھٹو صاحب سے ملاقات کرائے بغیر جیل حکاّم نے انہیں واپس کر دیا تھا۔

21 جون 1978ء کو مس بے نظیر بھٹو اپنے والد سے ملنے جیل میں آئیں۔ شاید یہ ان کا جنم دن تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک کیک لائیں جسے جیل حکام نے سیکورٹی وارڈ میں لے جانے کی اجازت نہ دی۔ بے نظیر صاحبہ نے ڈیوٹی پر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ وہ مارشل لاء حکام سے اجازت لے تاکہ وہ کیک اندر لے جاسکیں۔ ڈپٹی نے ٹیلیفون پر مجھے یہ قصّہ بتایا۔ میں نے فوراً ایس ایم ایل اے سے ٹیلیفون پر رابطہ قائم کر کے کیک بھٹو صاحب کے سیل میں لے جانے کی اجازت حاصل کی۔ مس بے نظیر بھٹو اس دوران ڈپٹی کے دفتر میں انتظار کرتی رہیں اور اجازت مل جانے پر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل کا شکریہ ادا کر کے سیکورٹی وارڈ گئیں۔ اس دن وہ بھٹو صاحب کے ساتھ پانچ گھنٹے اور سترہ منٹ رہیں۔ اسی دن تقریباً اڑھائی گھنٹے بعد بیگم بھٹو بھی آ گئیں اور تینوں نے مل کر جیل کے سیل میں مس بے نظیر کا برتھ ڈے منایا۔ اس وقت بھٹو خاندان پر بہت برُا وقت آیا ہوا تھا۔

میرا کردار۔ ایسی حالت میں ایک شخص جسے مارشل لاء حکاّم کی جانب سے حفاظتی انتظامات کی اعلیٰ ترین نگرانی کا کام سونپا گیا ہو، وہ کامیابی کے ساتھ اپنی ذمہ داری پوری کرنے پر ہر قسم کا کریڈٹ تو خود لے جانے کی کوشش کرتا ہے مگر جب حالات تبدیل ہو جائیں تو پھر وہ تمام ذمہ داری دوسروں کے کندھوں پر ڈال دیتا ہے اور اپنے آپ کو بالکل معصوم اور بے گناہ ظاہر کرتا ہے۔ لیکن میں ایک سپاہی ہوں اور مجھے اپنی فرض شناسی اور وفاداری پر بے حد فخر ہے۔ بھٹو صاحب کی اسیری کے دوران احکامات کی خلاف ورزی یا عذرداری کرنے پر چاہے اس کا تعلق جیل حکام سے تھا یا پولیس سے یا فوج سے، میں نے کبھی بھی ایسے آدمی کی جھاڑ جھپاڑ کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی لیکن بھٹو صاحب یا ان کے خاندان کے ہر فرد سے میرا رویہ ہمیشہ دوستانہ اور ہمدردانہ رہا۔ میں نے جیل میں بھٹو صاحب کی اتنی ہی عزت کی جتنی کہ میں ان کے ملک کا سربراہ ہونے کی صورت میں کرتا مگر بھٹو صاحب کی قید کے دوران میں ایک خاص ڈسپلن اور ضابطے کے تحت اپنے فرائض انجام دینے کا پابند تھا۔ دراصل یہی وجہ تھی کہ بھٹو صاحب نے مجھے بے حد

پسند کیا اور جب بھی میں ان کے پاس سیکورٹی وارڈ میں گیا تو انہوں نے صحن میں کرسی پر بیٹھے ہونے کی صورت میں ہر بار اٹھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور اگر سیل میں بستر پر لیٹے ہوئے ہوتے تو بھی مجھ سے اٹھ کر ملتے۔ گو میں نے ہر بار کوشش کی کہ ان کے اٹھنے سے پہلے ہی میں ان کو روک سکوں، لیکن انہوں نے مجھے بے حد عزت بخشی۔ انہوں نے مجھ سے بے حد کھل کر بے تکلف انداز میں مختلف موضوعات پر گفتگو کی۔ مجھے یہ سوچ کر حیرانی محسوس ہوتی رہی کہ وہ مجھ پر اتنے مہربان کیوں ہیں۔ مجھ سے انہوں نے کبھی ذکر تو نہیں کیا لیکن اپنی اسیری کے دوران بیگم نصرت بھٹو اور مس بے نظیر بھٹو صاحبہ سے انہوں نے میرے اچھے سلوک کا ذکر ضرور کیا ہو گا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ 3 اپریل 1979ء کو انہوں نے بھٹو صاحب سے آخری ملاقات کے فوراً بعد مجھ سے ملنا چاہا اور مجھ سے بیگم صاحبہ نے اپنی آخری اپیل کرنے کیلئے سی ایم ایل اے جنرل ضیاء الحق سے ملوانے کو کہا تھا۔ اس ضمن میں مجھے تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد ہر شخص کو بھٹو صاحب کی اسیری کے دوران میرے رویئے کے متعلق خود بخود اندازہ ہو جائے گا۔

پنجرے میں شیر۔ 19 مئی 1978ء کی شام تقریباً چھ بجے میں سیکورٹی وارڈ میں انتظامات کا جائزہ لینے کیلئے گیا۔ اس وقت اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ عمر دراز ڈیوٹی پر تھے اور میرے ساتھ تھے۔ انہوں نے کانٹے دار تاروں میں پہلے دروازے پر لگا ہوا تالا کھولا اور ہمارے اندر داخل ہونے کے بعد اس دروازے کو قفل لگا دیا۔ اسی طرح انہوں نے سیکورٹی وارڈ کے احاطے کے دروازے پر لگا ہوا تالا کھولا اور ہمارے داخلے کے بعد اسے بھی دوبارہ مقفّل کر دیا۔ صحن سے دالان میں داخل ہونے کے لئے بھی تالا کھولا گیا اور میں وارڈ میں داخل ہو گیا جبکہ عمر دراز وہاں وارڈروں کے ہمراہ صحن میں انتظار کرنے لگے۔
سب سے پہلے میں بائیں کمرے میں گیا جو گارد کیلئے مخصوص تھا۔ یہ کمرہ اس وقت خالی پڑا تھا۔ وہاں سے میں سامنے کے کمرے یعنی کچن سیل میں گیا جس میں، میں نے تمام برتنوں وغیرہ کا ملاحظہ کیا۔ فرج کو کھول کر تمام مشروبات اور دوسری اشیائے خوردنی کو دیکھا۔ اس سیل میں مجھے دو چار منٹ لگ گئے ہوں گے۔ وہاں سے نکل کر اس ملحق سیل میں گیا جس میں گارد کمانڈر کو رہنا ہوتا تھا۔ اندر جھانکنے کے بعد میں آگے غسل خانے والے سیل کی طرف ہوا ہی تھا کہ اس کی صفائی وغیرہ کو دیکھ سکوں کہ میری نظر اچانک بھٹو صاحب پر پڑی جو ایک دفتری کرسی پر اپنے سیل کے دروازے کی آہنی سلاخوں کے پیچھے بیٹھے تھے...... وہ بالکل خاموش، بے حس و حرکت اور اداسی کے عالم میں ڈوبے معلوم ہوئے۔ یہ ایک جگر سوز اور رقّت آمیز منظر تھا۔ وہ شاید مجھے غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی اس لاچاری و بے بسی نے مجھے ایک پنجرے میں شیر کی یاد دلائی۔ دراصل میرے لئے اتنے نزدیک سے شیر کو دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی اور میں بغیر آنکھیں چار کئے ہوئے یا سلام علیکم کہے کچھ اوپر کی طرف دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ سے ایسے واپس ہوا جیسے میں نے ان کو دیکھا ہی نہیں ہے اور خاموشی سے دالان سے باہر آ گیا۔

جب میں سیکورٹی وارڈ سے باہر آگیا تو میں نے اپنے آپ سے کہا کہ میں نے بھٹو صاحب کو سلام کیوں نہیں کیا؟ شاید مجھے ان کو اتنے نزدیک سے اس حالت میں دیکھنے کی جرأت وہمت نہ تھی۔ میں ان کے اس طرح لوہے کی سلاخوں کے پیچھے بے بسی کے عالم میں بیٹھے ہوئے منظر کو کبھی نہ بھول سکوں گا۔ اس دن گھر واپس آنے پر میں نے اپنی بیگم سے پورا قصہ بیان کیا۔ انہوں نے بھٹو صاحب کو "السلام علیکم" نہ کہنے پر کافی افسوس کیا۔ میرے باہر آنے کے کچھ دیر بعد بھٹو صاحب نے ہیڈوارڈر کو اندر بلایا اور پوچھا کہ یہ شخص جو تھوڑی دیر پہلے اندر آیا کون تھا؟ حالانکہ میں نے جیل افسران کو بتایا تھا کہ وہ مجھے جیل کا چیف سیکورٹی سپرنٹنڈنٹ کہا کریں گے لیکن اس نے بتایا کہ جناب وہ جیل کے ڈاکٹر تھے۔ اس پر بھٹو صاحب اس سے غصے ہوئے اور کہا کہ تم جھوٹ بولنا بھی نہیں جانتے۔ تقریباً آدھ گھنٹہ بعد انہوں نے ڈیوٹی پر جیل اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کو بلایا اور یہی سوال اس سے پوچھا۔ چونکہ وہ پہلے سن چکا تھا' اس نے بھی وہی جواب دیا۔ جب آخری روشنی (Last light) کا وقت آیا تو ڈپٹی جیل سپرنٹنڈنٹ سیکورٹی وارڈ میں گیا تاکہ تالا بندی کو چیک کر لے۔ بھٹو صاحب نے انہیں اندر بلایا اور ان سے پوچھا کہ جیل کا ڈاکٹر کس قابلیت کا مالک ہے۔ 18 مئی یعنی ایک روز پہلے جیل ڈاکٹر کو سیکورٹی وارڈ میں بھٹو صاحب کو چیک کرنے کیلئے بھیجا گیا تھا مگر انہوں نے بغیر چیک کروائے ڈاکٹر کو واپس کر دیا تھا۔ ڈپٹی نے بھٹو صاحب کو بتایا کہ جیل کا ڈاکٹر ایک تجربہ کار اور قابل شخص ہے۔ پھر بھٹو صاحب نے مزید پوچھا کہ اس جیل میں کتنے ڈاکٹر ہیں۔ ڈپٹی نے جواب دیا کہ جناب صرف ایک ڈاکٹر ہے۔ بھٹو صاحب نے ان سے مزید پوچھا کہ یہ شخص جو تقریباً ایک گھنٹہ قبل یہاں آیا تھا وہ کون تھا؟ چونکہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے' ڈپٹی نے جھٹ جواب دیا کہ جناب وہ نرسنگ ہے جسے ہم لوگ ڈاکٹر ہی کہتے ہیں۔ اس جواب پر بھٹو صاحب ڈپٹی پر برہم ہوئے اور اسے کہا کہ مجھے فریب مت دو۔ وہ ایک فوجی افسر تھا۔

بیگم بھٹو کی پہلی ملاقات۔ 21 مئی 1978ء کی صبح بیگم نصرت بھٹو کو بھٹو صاحب سے جیل میں ملاقات کیلئے پی آئی اے کے ذریعے ایک سپرنٹنڈنٹ پولیس کی معیت میں کراچی سے راولپنڈی لایا گیا۔ پولیس کار انہیں ایئرپورٹ سے جیل تک لائی۔ اس ملاقات کی خبر پریس میں چھپ چکی تھی اس لئے جیل کے باہر اس دن اچھا خاصا ہجوم ہو گیا تھا۔ کار کو جیل کے اندر ڈیوڑھی میں پارک کیا گیا۔ بیگم صاحبہ نے گاڑی کے رک جانے کے بعد اپنے پرس سے ایک پرفیوم کی بوتل نکالی اور اس سے اپنے آپ پر سپرے کیا۔ جس کی مسرور کن مہک نے جلد پوری ڈیوڑھی کو معطر کر دیا۔ وہ کار سے بڑی شان و شوکت کے ساتھ باہر تشریف لائیں۔ اس دن خوش لباسی کے ساتھ انہوں نے عمدہ میک اپ بھی کر رکھا تھا۔ انہیں جیل سپرنٹنڈنٹ' جو ڈیوڑھی میں ان کے استقبال کیلئے کھڑے تھے' سیدھے سیکورٹی وارڈ کی طرف لے کر چل دیئے۔ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ عمر دراز اور میں بھی کچھ فاصلے پر پیچھے پیچھے ہو لئے۔ بیگم صاحبہ جوں ہی سیکورٹی وارڈ کے صحن کے دروازے پر پہنچیں تو انہوں نے سنتری کیلئے لگے ہوئے الارم کے سوئچ کو لپک کر

دبادیا جس سے سیکورٹی وارڈ میں الارم گونج اٹھا۔ تمام گاردیں پہلے ہی "اسٹینڈ ٹو" حالت میں تھیں اور بیگم بھٹو کے ساتھ پوری پارٹی کو آتے دیکھ رہی تھیں' انہیں عدم تعمیل (No Action) کا اشارہ دیدیا گیا۔ اب بیگم صاحبہ کو بھی محسوس ہو گیا کہ یہ بٹن عام گھنٹی کا نہیں ہے پھر چودھری یار محمد نے بھی آہستہ سے انہیں بتایا کہ یہ بٹن نہ دبائیں کیونکہ یہ گارد کیلئے ہے۔ دالان سے باہر والے تالے کو بھی کھولا گیا اور اندر والے سنتری کو باہر جانے کا اشارہ ہوا اور بیگم صاحبہ' بھٹو صاحب کے سیل میں بھیج دی گئیں۔

بیگم نصرت بھٹو' محترمہ بے نظیر بھٹو اور ڈاکٹر نیازی کی ملاقات کے وقت اسپیشل پولیس کا ایک انسپکٹر ان کی ملاقات کی نگرانی کرنے جیل آیا کرتا تھا۔ مارشل لاء حکام نے اس کو دالان کے اندر' بھٹو صاحب کے سیل کے دروازے کے نزدیک بیٹھنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ وہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے ہمراہ وہاں بیٹھ گیا۔ خیال تھا کہ ملاقات کوئی گھنٹہ بھر ہوگی' مگر بیگم بھٹو صبح نوبج کر پینتیس منٹ (35ء9) سے لیکر بارہ بج کر پینتیس منٹ (35ء12) دوپہر تک یعنی تین گھنٹے سیل میں رہیں۔ پہلی ملاقات اتنی لمبی ہو جانے کی وجہ سے مارشل لاء حکام نے پوچھنا شروع کر دیا۔ جس پر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سے کہا گیا کہ یاددہانی کرادی جائے۔

ملاقات کے بعد جب بیگم بھٹو جیل سے روانہ ہو گئیں تو ڈپٹی نے بتایا کہ انہوں نے آخری تیس چالیس منٹوں میں چند مرتبہ یاددہانی کرائی۔ لیکن چونکہ بیگم صاحبہ نے اپنی تیاری کرنے پر کافی وقت لے لیا تھا اس لئے اتنی دیر ہو گئی۔ بعد کی ملاقاتوں میں بھی بیگم بھٹو ہمیشہ کچھ وقت یاددہانی کے بعد ضرور لیا کرتی تھیں۔

بھٹو صاحب کی پنڈی جیل میں اسیری کے وقت 17 مئی 1978ء سے 3 اپریل 1979ء کے دوران بیگم نصرت بھٹو صاحبہ چوالیس بار ان کے سیل میں ملاقات کیلئے آئیں۔ ان ملاقاتوں میں انہوں نے ایک سو دس گھنٹے اور بیس منٹ (20ء110 گھنٹے) کا مجموعی وقت بھٹو صاحب کے ساتھ ان کے سیل میں گزارا۔

محترمہ بے نظیر کی ملاقاتیں۔ بیگم بھٹو کی طرح محترمہ بے نظیر بھٹو بھی کراچی سے ہر ہفتے ایک پولیس افسر کی معیت میں پی آئی اے کے ذریعے راولپنڈی لائی جاتی تھیں اور ملاقات کے بعد اگلی فلائٹ سے واپس کراچی لے جائی جاتی تھیں۔ ان کی ملاقات کا طور طریقہ تقریباً بیگم بھٹو جیسا ہی ہوتا تھا۔ باپ بیٹی کی ملاقات کے دوران بہت کچھ تبادلہ خیال خاموش اشاروں کی زبان میں کیا جاتا جو زیادہ تر سرگوشیوں کے ذریعے یا پھر لکھ کر سمجھایا یا منتقل کیا جاتا تھا۔ ایسی ملاقاتوں کے دوران لوگوں کے کان کھڑے رہتے تھے لیکن ریکارڈ صرف وہی ہوتا تھا جو بھٹو کنبہ چاہتا تھا کیونکہ ان کی ملاقات کے دوران کافی دیر کیلئے صرف کاغذ کے اوراق الٹنے پلٹنے کی آواز سنائی دیتی یا بالکل خاموشی رہتی۔ اگر بھٹو صاحب حکام کو کچھ بتانا چاہتے یا انہیں گمراہ کرنا چاہتے تو پھر اونچی آواز سے بات چیت شروع ہو جاتی ورنہ پھر اچانک ایسی خاموشی جیسے بیٹھنے والے سیل سے

باہر نکل گئے ہوں۔

شروع شروع کی دوسری یا تیسری ملاقات کے دوران اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ عمر دراز نے بھٹو صاحب کے سیل کے اندر جھانکا تا کہ بتایا جائے کہ جناب وقت بہت ہو گیا ہے اور ملاقات کو ختم کریں۔ اس نے دیکھا کہ باپ بیٹی ایک ہی چارپائی پر دراز ہیں اور ان کے چہرے نزدیک نزدیک ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ فوراً پیچھے ہٹ گئے۔ ملاقات کے بعد محترمہ بے نظیر سیدھی سپرنٹنڈنٹ جیل کے دفتر میں آئیں اور انہوں نے اپنی ناخوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کم از کم جیل حکام کو اتنی تو خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنا چاہئے کہ ہماری ملاقات کے دوران خلل اندازی نہ ہو اور چیئرمین صاحب کی خلوت (Privacy) میں مداخلت نہ کی جائے۔ انہوں نے مارشل لاء حکام کو بھی برا بھلا کہا۔ ان کے چلے جانے کے بعد اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے پوری کہانی سنائی کہ محترمہ بے نظیر کی ناراضگی کی اصلی وجہ کیا تھی۔ یہ سن کر ہر ایک نے بڑی حیرانگی کا اظہار کیا۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ آپ لوگ بھی تو بھٹو صاحب سے جب کوئی راز کی بات کرنا چاہیں تو ان کو اشارے سے سیل سے باہر بلا لیا کرتے ہیں۔ محترمہ بے نظیر تو ان کو سیل سے باہر نہیں لا سکتیں اور باپ بیٹی میں تو ہزار ہا ایسے راز ہوں گے جو وہ دوسروں سے چھپانا چاہیں گے اور ان کے پاس تو صرف کان میں سرگوشیوں کا ہی ایک طریقہ موجود ہے۔ بہر حال جیل حکام میں یہ موضوع کافی دنوں تک زیر بحث رہا۔

محترمہ بے نظیر نے بھی بھٹو صاحب کے ساتھ چوالیس بار جیل میں ملاقات کی اور اپنے والد کے ساتھ مجموعی طور پر ایک سو چھ گھنٹے اور پندرہ منٹ (15ء106 گھنٹے) سیل میں گزارے۔

ایک ناخوشگوار واقعہ۔ بھٹو صاحب کے راولپنڈی جیل منتقل ہو جانے کے چند ہفتوں بعد مارشل لاء حکام کو اطلاع ملی کہ بھٹو صاحب اپنے دفاع میں ایک کتاب لکھ رہے ہیں جس کیلئے انہیں ہر قسم کا مواد ملاقاتیوں کے ذریعے باہر سے جیل میں پہنچایا جا رہا ہے۔ مجھے اور سپرنٹنڈنٹ جیل کو حکم ملا کہ تمام ملاقاتیوں کی' خاص کر بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر کے آتے جاتے تلاشی لی جائے۔ حکام کا شروع میں خیال تھا کہ وہ وکلاء کو بھی تلاشی سے مستثنیٰ نہ کریں' لیکن سپریم کورٹ نے ان کی تلاشی نہ لینے کیلئے کہا البتہ کورٹ نے وکلاء کو ویسے ہی خبردار کر دیا کہ شک ہونے کے بنا پر ان کی بھی جانچ پڑتال ہو سکتی ہے۔ اس حکم کے فوراً بعد محترمہ بے نظیر بھٹو راولپنڈی جیل میں اپنے والد صاحب سے ملنے آئیں۔ ان کے پاس ایک کافی بھاری بیگ تھا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ نے پہلے ہی ایک ہیڈوارڈر سے کہہ دیا تھا کہ ان کا سامان ان سے لیکر ڈپٹی کے دفتر کے اندر چلا جائے گا اور اسے کھول کر دیکھے گا کہ اس میں کیا کچھ ہے۔ جونہی محترمہ بے نظیر ڈیوڑھی میں پولیس کار سے اتریں تو اس ہیڈوارڈر نے ان سے بیگ لے لیا اور بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اندر دفتر میں چلا گیا۔ ہیڈوارڈر نے اندر جا کر بیگ کی زنجیری کھولی ہی تھی کہ محترمہ بے نظیر بھی اس دفتر میں داخل ہو گئیں اور اسے کہا "او بے وقوف! تم میرے بیگ کی تلاشی کیوں لے رہے ہو؟"

You / idiot! Why you are searching my Bag ?

اسے برا بھلا کہنے کے بعد انہوں نے مارشل لاء حکام کو بھی سنائیں مثلاً "بلڈی چور اور بد نیت لوگ۔ وہ چوروں کی طرح رات کے اندھیرے میں آئے ٹینک اور توپیں اپنے ساتھ لائے اور آئینی و جمہوری وزیر اعظم کو برطرف کیا، وغیرہ وغیرہ"

Bloody thieves, Unscruplous people they came like thieves in the darkness of the night, they brought tanks and guns like pirates at night and over threw the legal and democratic Prime Minister.

یہ کہتے ہوئے ہیڈوارڈر کے ہاتھ سے بیگ چھین لیا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ ہکابکا رہ گیا۔ لیکن پھر بھی اس نے ان کو اندر جانے دیا اور بھٹو صاحب سے ملاقات کرادی۔ جب مارشل لاء حکام کو اس کے متعلق بتایا گیا تو حکم ملا کہ آئندہ ماں، بیٹی یا کوئی بھی دوسرا ملاقاتی پوری تلاشی نہ دے تو اسے اندر ملاقات کیلئے نہ جانے دیا جائے اور بغیر ملاقات واپس کر دیا جائے حتیٰ کہ بیگم بھٹو اور محترمہ بے نظیر کے پرسوں (Purses) کی بھی تلاشی لینے کا حکم صادر ہو گیا۔

میرے خیال میں جون 1978ء کا آخری ہفتہ تھا کہ بیگم بھٹو ملاقات کیلئے تشریف لائیں۔ جیل سپرنٹنڈنٹ نے ان کے بیگ کو پولیس کار سے ہی لے لیا اور کار کے بونٹ پر رکھ کر بیگ کو کھول کر دیکھنا چاہا۔ بیگم صاحبہ نے غصے میں انہیں برا بھلا کہتے ہوئے بیگ فوراً ان سے لے لیا۔ یار محمد صاحب نے بڑے نرم اور خوش اخلاقی کے لہجے میں ان سے کہا "بیگم صاحبہ حکومت نے مجھے حکم دیا ہے کہ آپ کی ملاقات سے پہلے اور بعد آپ کے سامان کی تلاشی لی جائے" بیگم بھٹو نے کافی اونچی آواز میں ان سے کہا "تم کون ہوتے ہو میرے بیگ کی تلاشی لینے والے" جیل سپرنٹنڈنٹ نے پھر ان سے مؤدبانہ انداز میں کہا کہ تلاشی کا حکم ہے۔ اس کے بغیر آپ اندر نہیں جاسکیں گی۔ مگر بیگم صاحبہ نے تلاشی دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس پر سپرنٹنڈنٹ، میں اور اسپیشل پولیس انسپکٹر سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں چلے گئے حالانکہ حکم قطعی، صاف اور بالکل واضح مل چکا تھا لیکن پھر بھی ہم نے حکام بالا کو اس صورتحال سے آگاہ کیا۔ انہوں نے دوبارہ حکم دیا کہ اگر بیگم بھٹو اپنے سامان کی تلاشی نہ دینے پر بضد ہیں تو وہ بھٹو صاحب سے نہیں ملیں گی۔ ان کو واپس کراچی بھیج دیا جائے۔

سپرنٹنڈنٹ پولیس نے جو بیگم بھٹو کو کراچی سے اپنے ساتھ لایا تھا، ایس ایس پی راولپنڈی سے ٹیلیفون پر بات کی کہ بیگم بھٹو کی ملاقات نہیں ہو رہی اور کراچی واپسی کی فلائٹ میں ابھی کافی وقت ہے، انہیں کہاں لے جایا جائے؟ ان کو بتایا گیا کہ وہ بیگم بھٹو کو راول جھیل کے ریسٹ ہاؤس لے جائیں اور پی آئی اے کی فلائٹ ملنے تک کا وقت وہاں گزاریں۔

اس کے بعد چودھری یار محمد نے بیگم بھٹو کو بتایا کہ حکومت نے ان کی ملاقات کی اجازت نہیں دی اور وہ واپس جاسکتی ہیں۔ بیگم بھٹو اور بھی غصے میں آ گئیں اور انہوں نے جیل سپرنٹنڈنٹ کو کافی برا بھلا کہا۔ چونکہ سپرنٹنڈنٹ کیلئے ان کے ماتحتوں کے سامنے سخت الفاظ کہے گئے تھے اسلئے وہ بھی کچھ غصے میں آ

گئے۔ ان سے کہا کہ وہ جیل سے واپس چلی جائیں۔ اس پر بیگم بھٹو اور طیش میں آ گئیں اور انہوں نے ان سے کہا کہ تمہیں اس کا بدلہ ضرور ملے گا اور اسی اثنا میں ان کی گاڑی ڈیوڑھی سے باہر لے جائی جا رہی تھی کہ بیگم بھٹو نے کہا "بلڈی کُتّا، ڈیم سوائن، ایڈیٹ وغیرہ وغیرہ"

"Bloody Dog, Damn, Swine, idiot, Etc., etc."

ادھر بھٹو صاحب اپنے سیل میں انتظار کرتے رہے اور ایک دو دفعہ انہوں نے پوچھا کہ ان کی بیگم صاحبہ کیوں نہیں آئیں مگر انہیں کچھ نہ بتایا گیا۔ انہیں بعد میں معلوم ہوا جس پر انہوں نے جیل سپرنٹنڈنٹ کو اندر سیل میں بلایا اور ان پر بہت برہم ہوئے۔ انہوں نے یار محمد صاحب کو بتایا کہ ان کی بیگم کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرنے کی کسی کو جرأت نہیں ہو سکتی اور اس سے اس کا بدلہ لیا جائے گا۔ انہوں نے اسے کہا کہ ہزاروں جان فروش ایسے ہیں جو کسی بھی بھٹو کے ایک اشارے پر مرمٹنے کیلئے تیار ہیں۔ یار محمد کافی دن خاموش اور متفکر رہے۔

اس واقعہ کے کافی دنوں بعد بھٹو صاحب نے مجھ سے بھی اس کا ذکر کیا تھا اور آخر کار بتایا کہ سپرنٹنڈنٹ نے معمول کے مطابق سارا الزام بیچارے کرنل کے سر تھوپ دیا تھا کہ اسے کرنل نے تمام احکامات دیئے تھے۔ میں نے اس موقع پر انہیں سارا قصہ صحیح صحیح بتا دیا تھا۔ جس پر انہوں نے اپنی قدر دانی کا اظہار کیا لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی کہا "رفیع، آپ کے جرنیل کتنی حقیر، ذلیل اور کمینی حرکتوں پر اتر آئے ہیں"۔

بھٹو صاحب کے ساتھ میری پہلی ملاقات:۔ بھٹو صاحب کے راولپنڈی جیل منتقل ہوتے ہی مجھے ان سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا، لیکن چند وجوہات کی بنا پر ان سے باقاعدہ ملاقاتوں کو چند ہفتے لگے۔ ویسے تو میں سیکورٹی وارڈ پہلے دن یعنی 17 مئی 1978ء کو بھی گیا تھا لیکن ان سے ملنے کی ہمت نہ ہوئی۔ پھر جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں 19 مئی کو وارڈ کے اندر گیا، ان کو بیٹھے ہوئے دیکھا مگر ان سے ملنے کی جرأت نہ پائی اور خاموشی سے باہر آ گیا۔ اپنے فرائض کے سلسلے میں مئی کے دوسرے ہفتے سے ہی پنڈی جیل میں جانا میرا روزمرہ کا معمول بن گیا تھا بلکہ کبھی کبھار دو تین مرتبہ بھی جانا پڑتا تھا۔ بھٹو صاحب کے آ جانے کے بعد تو دن کا زیادہ وقت میں یا تو جیل سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں یا جیل کے شمالی احاطے میں، جہاں میری بٹالین مع دفاتر منتقل ہو چکی تھی، گزارتا تھا۔ سیکورٹی وارڈ میں چکر لگانا اور ڈیوٹی افسر اور دوسری گاردوں کو دیکھنا بھی میرا معمول بن چکا تھا۔ میں عموماً عام قسم کے بش شرٹ اور پتلون میں ملبوس رہا کرتا تھا (میں نے چند جوڑے کپڑوں کے ڈیوٹی افسر کے کمرہ میں ہی لٹکا رکھے تھے تاکہ موقع محل کے مطابق فوراً لباس تبدیل کر سکوں) تاکہ بھٹو صاحب سے ملنے والے وکلاء اور ان کے رشتہ دار مجھے جیل کا ایک ماتحت افسر ہی سمجھیں، لیکن وکلاء تو جلد ہی پہچاننے لگ گئے۔ البتہ بیگم بھٹو صاحبہ اور مس بے نظیر صاحبہ نے مجھے پہچاننے میں کافی وقت لیا۔

پہلے چند ہفتوں کے دوران جب تک میں بھٹو صاحب سے نہ ملا تھا اور مارشل لاء اتھارٹی کے احکام کا بڑی سختی سے اطلاق کیا جا رہا تھا اور شاید جب بھی بھٹو صاحب نے اعتراض کیا تو جیل کے حکام نے تمام الزام کرنل انچارج کے سر تھوپ دیا۔ بھٹو صاحب ان کے فیملی ممبر یا ان کے وکلاء نے ظاہر ہے کرنل انچارج کو ہی تمام سختیوں کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ ادھر میں بھٹو صاحب سے ملاقات کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ میں ان سے سیل کے اندر ملنے کی بجائے باہر کورٹ یارڈ میں ملنا چاہتا تھا تاکہ کھل کر بات چیت کر سکوں۔ بھٹو صاحب کو پھانسی کے سزا یافتہ مجرموں کی طرح آدھ گھنٹہ صبح اور آدھ گھنٹہ شام سیل سے باہر ٹہلائی کی اجازت تھی۔ وہ صبح بہت دیر سے اٹھتے تھے اور جون جولائی میں صبح نو دس بجے کے بعد باہر کافی گرمی ہو جاتی تھی۔ اسلئے وہ صبح کی ٹہلائی نہیں کیا کرتے تھے اور صرف شام کو ہی باہر کورٹ یارڈ میں نکل کر بیٹھتے اور چائے وغیرہ نوش کیا کرتے۔ ایک شام، شاید جون کا پہلا یا دوسرا ہفتہ تھا جب میں نے یقین کر لیا کہ بھٹو صاحب باہر اکیلے بیٹھے ہیں تو میں نے جا کر ان سے ملنے کا ارادہ کیا۔ میں اس دن وردی پہن کر اور قمیص پر اپنے نام کی پلیٹ لگا کر آیا تھا۔ میں نے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کو، جو اس وقت ڈیوٹی پر تھا، بلایا اور کہا کہ میں سیکورٹی وارڈ چیک کرنا چاہوں گا۔ انہوں نے باہر کانٹے دار تاروں والے جنگلے کے گیٹ کا تالا کھولا پھر سیکورٹی وارڈ کے کورٹ یارڈ کا تالا کھولا اور چونکہ بھٹو صاحب باہر ہی بیٹھے ہوئے تھے ڈپٹی کو وہیں چھوڑ کر میں اندر چلا گیا۔ دروازے کے پردے کی دیوار کے پیچھے بھٹو صاحب ایک عام کرسی پر بیٹھے تھے وہ مجھے اچانک دیکھ کر اچنبھے میں پڑ گئے۔ میں ان سے تین یا چار گز کے فاصلے پر تھا اور ان کے چہرے کے تاثرات تک دیکھ سکتا تھا۔ جونہی انہوں نے مجھے دیکھا ان کے چہرے پر کچھ لالی نمودار ہوئی اور کچھ غصے کے آثار نظر آئے، حتیٰ کہ ان کی آنکھوں کے نیچے اور گالوں کے اوپر والا چمڑا چند مرتبہ پھڑکا اور مجھے ایسے محسوس ہوا کہ میں نے مصیبت مول لے لی ہے۔ بہرحال میں نے ان کے سامنے ہوتے ہی فوجی طریقے سے با ادب سلام کیا۔ فوراً ان کے چہرے سے ان کی طبیعت کا کچھ ہلکا پن محسوس ہوا لیکن وہ پھر بھی متعجب تھے۔ انہوں نے دایاں ہاتھ بڑھاتے ہوئے مجھ سے مصافحہ کیا اور کہنے لگے آپ بیٹھنا پسند کریں گے۔ انہوں نے مشقتی کو آواز دی کہ کرسی لاؤ (بھٹو صاحب کو ایک قیدی انکی خدمت کیلئے دیا گیا تھا) میں بھٹو صاحب کے نزدیک کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے چپکے سے گزرے۔ پھر انہوں نے خاموشی توڑتے ہوئے فرمایا۔ کرنل رفیع (میرا نام میری وردی پر چسپاں تھا) آپ نے یہاں آنے کی تکلیف کیسے گوارا کی؟ میں نے جواب میں کہا۔ جناب میں بہت پہلے آنا چاہتا تھا لیکن کسی نہ کسی وجہ سے ایسا نہ کر سکا۔ اب میں آپ کو صرف سلام کرنے آیا ہوں۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ آپ جس وقت چاہیں بڑے شوق سے آئیں۔ اس پر میں نے ان کا دلی شکریہ ادا کیا۔ اس پہلی ملاقات میں ہم دونوں کچھ لئے دیئے (Reserved State) سے رہے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں چائے یا کافی پسند کروں گا۔ میں نے انہیں جواب میں کہا کہ جناب میری کوئی خاص ترجیح نہیں آپ جو پسند کریں میں بھی پی لوں گا۔ چونکہ میرے آنے سے پیشتر انہوں نے

مشقّتی کو چائے کیلئے کہا تھا اس لئے انہوں نے اسے آواز دی کہ میرے لئے بھی چائے لائے۔ ہم نے چائے تقریباً خاموشی سے نوش کی۔ میں نے جان بوجھ کر ان سے کسی خدمت کا نہ پوچھا کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ اگر انہوں نے کسی کام کیلئے کہہ دیا اور وہ میرے اختیار میں نہ ہوا تو پھر کیا ہو گا۔ ایک زیرک اور عقلمند انسان ہونے کی وجہ سے بھٹو صاحب نے بھی اس قصے کو چھیڑا تک نہیں۔ چائے کے بعد اجازت لینے سے پہلے میں نے ان سے کہا کہ شاید آپ کو مجھ سے کچھ شکایات ہوں گی لیکن انہوں نے فوراً کہا کہ نہیں کوئی خاص نہیں۔ میں نے ان سے جانے کیلئے اجازت چاہی اور اٹھ کر ان کو فوجی طریقے سے سلام کیا۔ وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے مصافحہ کیا اور کہنے لگے کہ کرنل رفیع کبھی کبھار ضرور چکر لگا لیا کرو۔ میں نے جواب میں کہا کہ جناب میں ضرور حاضر ہوتا رہوں گا اور پھر میں سیکورٹی وارڈ سے باہر آ گیا۔

مجھے بھٹو صاحب سے ملاقات کے متعلق کوئی خاص ہدایات نہ تھیں۔ شروع شروع میں جب بھی ایس ایم ایل اے نے مجھ سے ان کے متعلق پوچھا تو میں نے انہیں بتایا کہ میں سیکورٹی وارڈ جا کر ان سے کبھی نہیں ملا اور صرف جیل حکام کے "سب اچھا" کی رپورٹ پر آپ کو اسی قسم کی رپورٹ دیدیتا ہوں۔ ایک دن ان کے اس طرح کے سوال پر میں نے ان سے کہہ دیا "جناب صاف بات تو یہ ہے کہ مجھے یہ یقین نہیں ہے کہ آیا بھٹو صاحب بنفسِ نفیس جیل میں حاضر ہیں یا نہیں جیل حکّام کی "سب اچھا" رپورٹ پر میں بھی آپ کو ہر روز " All ok " رپورٹ دیدیتا ہوں"۔ اس دن مجھے ایس ایم ایل اے نے کہا کہ تمہیں کبھی کبھار اندر جا کر انہیں ضرور دیکھ لینا چاہئے۔ اُس دن کے بعد، چونکہ مجھے ایک دستخط شدہ چیک مل گیا تھا، میں نے سیکورٹی وارڈ جا کر بھٹو صاحب سے ملنا شروع کر دیا اور اس اجازت نامے کو خوب استعمال کیا۔ میرے بھٹو صاحب سے ملنے پر جیل حکام یہی سمجھتے رہے کہ مجھے مارشل لاء حکام کی طرف سے ان سے ملنے یا کوئی خاص بات چیت کا حکم ہو گا۔

میری بعد کی ملاقاتیں - میری شروع شروع کی ملاقاتوں کے دوران بھٹو صاحب کافی محتاط رہا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں شاید جنرل ضیاء الحق صاحب کا خاص آدمی ہوں اور ان کی ہر بات جنرل صاحب تک پہنچاتا ہوں گا لیکن میں نے ان کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ میرے جنرل صاحب کے ساتھ ایسے کوئی تعلقات نہیں۔ بہر حال ان کو کافی دیر تک یہ شک ضرور رہا ہو گا جب تک کہ ہم آپس میں بہت بے تکلف نہ ہو گئے۔ میں جب بھی سیکورٹی وارڈ میں بھٹو صاحب سے ملنے گیا تو ان کی بہت تعظیم کی۔ اگر میں وردی میں ہوتا، جو بہت کم موقعوں پر پہنا کرتا، تو ان کو فوجی طریقے سے سلام کرتا۔ پرائیویٹ لباس میں یا شام کو کھیلوں کی حالت میں ہوتا تو بھی مروّجہ طور طریقے کے مطابق ان کو سلام کرتا۔ بعد میں جب ہم بے تکلف ہو گئے تو بھی میں نے ان سے کبھی مذاق یا عام لہجے میں کبھی بات چیت نہیں کی۔ میں آخر تک ان کی بے حد عزت و احترام کرتا رہا کیونکہ ان کی شخصیت نے مجھ پر بے حد اثر ڈالا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا ان کے ساتھ عام برتاؤ بالکل ایسا تھا جیسا کہ وہ ملک کے وزیر اعظم ہوں اور میں ایک فوجی افسر۔ ان کی شخصیت

ایسی پر کشش تھی کہ ہر شخص ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ کچھ مدت تک تو ان کا احترام و عزت کرنے کی وجوہات صرف یہ تھیں جو میں بیان کر چکا ہوں لیکن ان کی اسیری کے آخری دنوں میں جب مجھ پر ایسی باتیں کھلیں جو سراسر نا انصافی پر مبنی تھیں تو مجھے سخت دھچکا لگا اور میرا ضمیر بے حد متاثر ہوا۔ ان حالات کو میں اس کتاب میں موزوں جگہ پر بیان کروں گا۔

تمام حقیقتوں کے باوجود ایک سپاہی کا فرض دوسری ہر چیز پر مقدم رہا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے فرائض کے ساتھ ساتھ میرا برتاؤ بے حد دوستانہ رہا۔

اگر کبھی میں نے صبح کے وقت ان کے سیل کا معائنہ کیا تو عموماً بات چیت سلام دعا تک ہی محدود رہتی تھی۔ ان کا رویّہ یا بات چیت بھی رسمی ہوا کرتی تھی اور اگر وہ حکام کو کچھ بتانا چاہتے تو مجھ سے سخت کلامی بھی کرتے لیکن ان کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ ہی رہتی یا وہ ایک آنکھ دبا دیا کرتے اور اپنی آواز کرخت کر لیا کرتے تاکہ خفیہ آلات ہر لفظ کو اچھی طرح سن سکیں اور ریکارڈ ہو سکے۔ شام کو جب میں ان کے سیل میں جاتا تو وہ کہا کرتے کہ یہاں بہت گھٹن ہے باہر صحن میں بیٹھتے ہیں اور ہم باہر کھل کر بات چیت کیا کرتے۔ اور جب میں رات نو یا دس بجے کے بعد سیکورٹی وارڈ میں جاتا جبکہ لوگ اپنی دکان بند کر چکے ہوتے تو ہم کئی کئی گھنٹے گپ شپ میں گزارتے۔ ایسی حالت میں جب کبھی میں نے اپنی گھڑی کو دیکھا تو وہ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ کرنل رفیع میں تمہاری ذمہ داری میں ہوں جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں تمہیں وقت کا کوئی خیال یا جلدی نہیں ہونی چاہئے۔ رات گئے جب بھی میں ان کے سیل جایا کرتا تو وہ کافی خوشی محسوس کیا کرتے۔ ایسی ملاقاتوں میں بھٹو صاحب خوب بولا کرتے تھے۔ چونکہ جیل میں ان کے وکلاء محدود وقت کیلئے آتے اور وہ بھی کیس کے متعلق بات چیت کرتے۔ بھٹو بیگمات ہفتہ میں صرف ایک ایک چکر لگا سکتی تھیں اور اتنی خانگی باتیں ہوتی ہوں گی جو ختم ہی نہ کر سکتے ہوں۔ اسی طرح جیل کے حکام صرف ایک آدھ منٹ کیلئے اندر جا سکتے تھے اور وہ بھی سیل میں بات چیت کرتے۔ دراصل میرے علاوہ بھٹو صاحب کے ساتھ اندر یا باہر کوئی جیل والا بیٹھ کر بات چیت کرنے کی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ جیل کا نچلے والا اسٹاف یعنی وارڈرز وغیرہ تو بیچارے ان پڑھ اور کسی قسم کی بات چیت کرنے کے قابل ہی نہ تھے۔ اس لئے جب کبھی میں ان کے ہتھے چڑھ جاتا تو وہ خوب باتیں کیا کرتے تھے۔ عموماً اس دن کی خبریں جو اخبار میں چھپتیں یا حالاتِ حاضرہ پر وہ بھرپور تبصرہ اور حکومت کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کیا کرتے تھے۔ میری اور ان کی بیٹھک عموماً یکطرفہ ہوا کرتی تھی۔ سارا وقت وہی بولتے رہتے تھے اور میں بیٹھا غور سے سنتا رہتا تھا۔ بحث میں میرا حصہ "ہاں جناب" "نہیں جناب" "میں کچھ کہہ نہیں سکتا جناب" وغیرہ وغیرہ ہی ہوا کرتا تھا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے آج تک ان جیسا تیز فہم ' زیرک اور ذہین شخص نہیں دیکھا۔ وہ میرے ساتھ یکطرفہ بحث شروع کرتے۔ میں ہاں جناب 'نہیں جناب ' سے جواب دیتا رہتا لیکن پھر بھی مجھے اپنے ساتھ چلا کر اچانک سوال کر دیتے اور اگر میں کہتا کہ مجھے افسوس ہے کہ میں اس کے متعلق کچھ کہہ

نہیں سکتا تو وہ فوراً موضوع بدل دیتے اور دوسرے امور کو زیرِ بحث لے آتے اور پھر اچانک اسی نکتے کو اس طرح واپس لے آتے کہ مَیں لاجواب سا ہو کر رہ جاتا کبھی کبھار وہ مجھے بحث مباحثہ میں جوش دلاتے۔ اشتعال دلاتے۔ بھڑکا دیتے یا جان بوجھ کر غلط بیانی کرتے اور اگر پھر بھی میں خاموش رہتا تو مذاقاً مجھے کہا کرتے کہ رفیع صاحب اتنا بھی لاعلم اپنے آپ کو ظاہر نہ کرو۔ بہر حال ان کی باتیں سننے میں بڑا مزہ آتا اور مجھ پر بہت سے راز کھلتے رہے۔ جب کبھی وہ ہلکے پھلکے موڈ میں ہوتے تو اپنے جنسی تجربات پر بھی کچھ نہ کچھ کہہ جاتے۔ شروع شروع کے دنوں میں ان کے ایسے ریمارک کچھ عجیب سے لگے اور میں سمجھتا تھا کہ شاید مجھے وہ عام فوجی سمجھ کر اپنے اعتماد میں لینا چاہتے ہیں یا اس فوجی کمزوری کو مہمیز (Exploit) کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن بعد میں مجھے محسوس ہوا کہ یہ جیل میں مایوسی وغیرہ کا اثر ہے۔ ایسے لمحات میں انہوں نے کئی پردہ نشینوں کا بھی ذکر کیا لیکن میں اس کتاب میں ان باتوں کو کوئی جگہ نہیں دے رہا۔

ہماری ملاقاتوں کے دوران بھٹو صاحب نے ملکی اور غیر ملکی حالات پر بھی روشنی ڈالی۔ بہت سی ملکی اور عالمی شخصیات بھی زیرِ بحث لائے۔ ان موضوعات پر میں اس کتاب میں "بھٹو صاحب کی باتیں" والے باب میں اظہارِ خیال کروں گا۔ سوائے دو تین باتوں کے جن کا صیغۂ راز میں رہنا ہی قومی و ملکی مفاد میں ہے۔

مسوڑھوں اور دانتوں کی تکلیف:۔ راولپنڈی جیل میں اسیری کے دوران بھٹو صاحب کے مسوڑھے اور دانت اکثر ان کو تکلیف دیتے رہے۔ کبھی کبھار ان کے مسوڑھے بہت زیادہ سوج جاتے اور ان سے خون رسنے لگتا۔ وہ ہر روز چند مرتبہ لسٹرین (Listrine) سے اپنے منہ کے گارگل (Gargle) کیا کرتے تھے۔ اس مقصد کیلئے لسٹرین کی بوتلوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ان کے پاس ہر وقت موجود رہتا تھا۔ اگست 1978ء میں تکلیف زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے انہوں نے کسی ڈینٹل سرجن کو بلوانے کیلئے کہا۔ ان دنوں وہ کھانا تک نہ کھا سکتے تھے۔ جیل سپرنٹنڈنٹ نے بھی مجھے بتایا کہ بھٹو صاحب کے مسوڑھوں اور دانتوں میں سخت تکلیف ہے اور وہ کھانا کھانے سے بھی قاصر ہیں۔ میں نے ایس ایم ایل اے کو حالات سے آگاہ کیا۔ (بریگیڈیئر خواجہ راحت لطیف صاحب نے اگست 1978ء کے پہلے ہفتہ میں بریگیڈیئر ایم ممتاز ملک صاحب سے چارج لے لیا تھا اور وہ آخیر تک ان فرائض کو سرانجام دیتے رہے) بریگیڈیئر خواجہ راحت لطیف (بعد میجر جنرل) نے جی ایچ کیو میں سرجن جنرل سے کہا کہ سی ایم ایچ سے کسی اچھے ڈینٹل سرجن کو پنڈی جیل میں بھٹو صاحب کے علاج کیلئے بھیجیں۔ اس پر میجر محمد حنیف خٹک کو راولپنڈی جیل بھیجا گیا۔ وہ ایک بہت ہی قابل ڈینٹل سرجن تھے۔ وہ 26 اگست 1978ء کی صبح پنڈی جیل میں آئے اور کوئی آدھ گھنٹہ بھٹو صاحب کے سیل میں رہے اور ان کا علاج کیا۔ بھٹو صاحب کو ان کے علاج سے فوراً صحت یابی ہوئی۔ میجر حنیف خٹک نے علاج کے بعد مجھے بتایا کہ بھٹو صاحب سخت جنجی وائٹس (Acute Gingivitis) میں مبتلا ہیں اور انہیں مزید علاج کی ضرورت ہے۔ چند دنوں بعد بھٹو

صاحب نے مجھے میجر محمد حنیف خٹک کیلئے پھر کہا لیکن حکام نے ان کو دوبارہ بھٹو صاحب کے علاج کیلئے اجازت نہ دی اور مجھے بتایا گیا کہ آئندہ کوئی فوجی ڈاکٹر بھٹو صاحب کے علاج کیلئے نہیں بلایا جائے گا۔ ادھر بھٹو صاحب نے بار بار میجر محمد حنیف خٹک کیلئے کہا۔ میرے دوبارہ کہنے پر مجھے بتایا گیا کہ بھٹو صاحب کو بتا دیا جائے کہ وہ ڈینٹل سرجن پنڈی سے تبدیل ہو گیا ہے۔ حالانکہ میجر محمد حنیف خٹک بعد میں لیفٹیننٹ کرنل ہوئے اور اس وقت سے راولپنڈی ملٹری ہسپتال میں ہی کام کرتے رہے اور دل کے بائی پاس کی وجہ سے انگلینڈ میں جون 1990ء میں انتقال کر گئے۔

بھٹو صاحب کے منہ کی تکلیف زیادہ بڑھ گئی تو ڈاکٹر طارق محمود اور پھر ڈاکٹر رشید راولپنڈی ہسپتال سے بلوائے گئے جو ان کا علاج ستمبر 1978ء میں کرتے رہے۔ بعد میں جب ڈاکٹر ظفر نیازی صاحب کو جیل سے رہائی ملی تو انہوں نے 24 اور 27 نومبر 1978ء کو جیل میں بھٹو صاحب کے دانتوں وغیرہ کا علاج کیا۔ حکومت کو ڈاکٹر ظفر نیازی کا بھٹو صاحب سے اکیلا ملنا پسند نہ تھا اسلئے ڈاکٹر محمد سلیم چیمہ کو بھی، جو پرنسپل ڈی مونٹمورنسی کالج آف ڈنٹسٹری لاہور

Principal De-Montmorency College of Dentistry Lahore.

تھے، بلایا جاتا تھا اور یہ دونوں ڈاکٹر صاحبان اکٹھے بھٹو صاحب کا علاج ان کے سیل میں کیا کرتے تھے۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ دونوں ڈاکٹر صاحبان ذاتی طور پر ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ بہرحال انہوں نے سیکورٹی وارڈ میں 3 دسمبر 1978ء سے 3 فروری 1979ء کے دوران بھٹو صاحب کا چار دفعہ علاج کیا۔

15 جنوری 1979ء کو ڈاکٹر زینت، بیگم ڈاکٹر مبشر جو پیتھالوجسٹ (Pathologist) بھی ہیں سنٹرل ہسپتال راولپنڈی سے تشریف لائیں اور انہوں نے بھٹو صاحب کے خون کا نمونہ لیا۔ 3 فروری 1979ء کے دن ڈاکٹر نیازی اور ڈاکٹر چیمہ بھٹو صاحب کے علاج کیلئے جیل میں آئے۔ علاج کے بعد ڈاکٹر چیمہ صاحب جنرل شاہ رفیع عالم، ڈی ایم ایل اے سے ملنے آئے۔ میں اس وقت جنرل صاحب کے ساتھ ان کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے گفتگو کے دوران جنرل صاحب کو بتایا کہ وہ خود ڈینٹل سرجن کے علاوہ پیتھالوجسٹ بھی ہیں اور انہیں معلوم ہے کہ ڈاکٹر زینت مبشر، بھٹو صاحب کے خون میں ایسی بیماری تلاش کرنے کی کوشش کر رہی ہیں جو خطرناک ہو تاکہ ٹیکنیکی لحاظ سے بھٹو صاحب کو پھانسی نہ لگائی جا سکے۔ جنرل شاہ رفیع عالم صاحب نے ان کا شکریہ ادا کیا اور انہیں یقین دلایا کہ ڈاکٹروں کو اس کی اجازت نہیں دی جائے گی اور بھٹو صاحب کے خون کا تجزیہ ایسی لیبارٹری سے کرایا جائے گا جہاں پیپلز پارٹی کی رسائی نہ ہو سکے گی۔

بہرحال بھٹو صاحب کے مسوڑھوں کی بیماری آخر تک رہی اور آخری رات (3-4 اپریل 1979ء) جب بھٹو صاحب کو ان کی پھانسی کی خبر سنا دی گئی تو بھی انہوں نے جیل سپرنٹنڈنٹ کو باقی

مطالبات کے ساتھ یہ مطالبہ بھی دیا کہ ان کے دانت اور مسوڑھے بے حد خراب ہیں۔ ڈاکٹر ظفر نیازی کو فوراً ان سے ملایا جائے تاکہ وہ انہیں اس تکلیف سے نجات دلا سکیں۔ پوری تفصیل اس کتاب کے باب "آخری لمحات" میں لکھی گئی ہے۔

عید مبارک:۔ سال میں دونوں عیدوں کے موقعوں پر 111 بریگیڈ کی پلٹنوں کے کمانڈنگ آفیسرز عموماً آرمی ہاؤس جا کر پریذیڈنٹ کو عید مبارک کہا کرتے تھے۔ عیدالفطر جو شاید ستمبر 1978ء کے پہلے ہفتہ میں آئی کے موقع پر میں اپنی بیگم کے ہمراہ آرمی ہاؤس میں صدر صاحب اور بیگم صاحبہ کو عید مبارک کہنے گیا۔ واپسی پر ہم راولپنڈی جیل کے پاس سے گزر رہے تھے کہ میری بیگم نے بھٹو صاحب کے متعلق پوچھا اور کہا کہ کیا ہم ابھی جا کر ان کو بھی عید مبارک کہہ سکتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ ایسا ممکن نہیں ہے اور وہ کیوں مجھے فوج سے نکلوانا چاہتی ہیں۔ وہ کہنے لگیں کہ تم اکیلے تو جا سکو گے۔ لہٰذا ان کو ہم سب کی طرف سے عید مبارک کہنا۔

میں نے جواب میں کہا آج تو میں بہت زیادہ مصروف رہوں گا اسلئے جیل کے اندر جانا شاید ممکن نہ ہو سکے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ مجھے آج ہی جا کر بھٹو صاحب کو عید مبارک کہنی چاہئے کیونکہ عید والے دن "عید مبارک" کا ان سے زیادہ حقدار کون ہو سکتا ہے؟ اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ان کی طرف سے بھی بھٹو صاحب کو عید مبارک کے ساتھ ان کی نیک اور دلی تمنائیں پہنچائی جائیں۔

بیگم صاحبہ کو گھر چھوڑنے کے بعد میں سیدھا جیل کی سیکورٹی وارڈ میں گیا جہاں بھٹو صاحب سیل میں اکیلے کرسی پر خاموشی سے بیٹھے تھے جو اس دن کے حوالے سے بے حد جگر سوز منظر تھا۔ میں نے ان کو عید مبارک کہی تو وہ مسکرا دیئے اور میرا شکریہ ادا کیا۔ عید کی وجہ سے ہر طرف چھٹی تھی اور ڈیوٹی والے لوگ بھی اپنی دکان کو تالا لگا گئے تھے۔ میں نے بھٹو صاحب کو صاف صاف بتایا کہ میں اور میری بیگم جب تھوڑی دیر پہلے ساتھ والی سڑک سے گزر رہے تھے تو وہ چاہتی تھیں کہ ہم دونوں یہاں آ کر آپ کو عید مبارک کہیں لیکن ایسا ممکن نہ تھا۔ بہرحال ان کی طرف سے بھی آپ عید مبارک اور نیک تمنائیں قبول کیجئے۔ بھٹو صاحب کچھ جذباتی سے ہو کر بولے "میں آپ کی بیگم کا بے حد مشکور ہوں" اور انہوں نے بھی جواباً عید مبارک اور نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔ اس موقع کے بعد بھٹو صاحب نے کئی دفعہ مجھ سے پوچھا کہ میری بیگم صاحبہ کا کیا حال ہے اور ہر دفعہ نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

مشقتی۔ جیل کے قیدیوں میں سے جو کھانا پکانا جانتا تھا بھٹو صاحب کو ان کے کام کاج کیلئے نوکر کے طور پر ایک قیدی دیا گیا تھا، جسے عرف عام میں مشقتی کہا جاتا ہے۔ ابتدائی ایام میں ایک فوجی بھگوڑے کو جسے کورٹ مارشل میں سزا ہوئی تھی اور پنڈی جیل میں وہ اپنی قید کاٹ رہا تھا، جیل حکام نے بھٹو صاحب کے ساتھ مشقتی کے طور کام کرنے کیلئے مامور کیا۔ بیگم بھٹو پہلی بار بھٹو صاحب سے ملاقات کیلئے جب پنڈی جیل آئیں اور اس مشقتی نے چائے وغیرہ سے ان کی خاطر تواضع کی تو بیگم صاحبہ نے اس سے بات

چیت کی جس میں اس کے منہ سے کوئی انگریزی کا لفظ نکلا ہو گا، جس پر بیگم بھٹو نے اس کے ماضی کے متعلق سوال و جواب کئے۔ اس مشقتی نے بتایا کہ وہ فوج سے بھاگ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ اس جیل میں سزا کاٹ رہا ہے۔ شاید بیگم بھٹو کو شک ہوا ہو گا کہ فوج نے اسے بھٹو صاحب کی مخبری وغیرہ کیلئے اس کام پر لگایا ہو گا۔ ملاقات کے بعد بیگم صاحبہ نے اخبارات کو بیان دیا کہ مشقتی ٹی بی کا مریض ہے اور بھٹو صاحب کے ساتھ نوکر کے طور پر کام کرنے کیلئے موزوں نہیں ہے۔ جیل ڈاکٹر سے اس کا معائنہ کرایا گیا تو وہ اس بیماری سے مبرا نکلا۔ ویسے بھی میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس مشقتی کا فوج یا جیل کے حکام سے کوئی ملاپ نہ تھا۔ بہرحال جلد ہی اس کی قید ختم ہو گئی اور اسے رہا کر دیا گیا۔ دوسرا مشقتی جسے جیل حکام نے اس کام کے لئے چنا وہ بھی فوجی باورچی تھا جو کسی جرم کی بنا پر جیل میں قید کاٹ رہا تھا۔ یہ مشقتی بھٹو صاحب کی خدمت کے دوران ان کے ساتھ کافی بے تکلف ہو گیا۔ وہ سیل میں فوج کے خلاف صرف بات چیت ہی نہ کرتا تھا بلکہ مارشل لاء حکام کیلئے کافی غلیظ زبان بھی استعمال کرتا تھا۔ حکم ملا کہ اس کو یہاں سے ہٹا کر کسی سخت کام پر لگا دیا جائے۔ اسے خوش خبری سنائی گئی کہ چند دنوں میں اس کے اچھے کام کی بدولت اس کی بقیہ قید معاف ہو جائے گی۔ لیکن سیکورٹی وارڈ سے باہر لا کر اسے کسی پُرمشقت کام پر لگا دیا گیا۔ اس بیوقوف کو بھٹو صاحب کی خدمت اور خوشنودی کے علاوہ اپنا آرام بھی راس نہ آیا۔ تیسرا مشقتی جس کا نام عبدالرحمٰن تھا، گولڑہ کے نزدیک ضلع راولپنڈی کا رہنے والا تھا۔ اس مشقتی نے بھٹو صاحب کی خوب خدمت کی۔ وہ ان کے ساتھ آخری وقت تک رہا۔ وہ بھٹو صاحب کو دل و جان سے چاہتا تھا اور دن رات سیکورٹی وارڈ کے کچن میں بھٹو صاحب کی کال کا منتظر رہتا تھا۔ بھٹو صاحب کو جب 3۔ 4 اپریل 1979ء کی رات پھانسی کیلئے لے جایا جا رہا تھا تو اس شخص کے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی جو بھٹو صاحب کے نصیب میں نہ تھی، جس کا تفصیلاً بیان اس کتاب کے اگلے صفحات پر کیا جائے گا۔

ہیئر کٹ:۔ بھٹو صاحب سر کے بال خوب لمبے رکھتے تھے۔ راولپنڈی جیل میں تقریباً گیارہ ماہ کی اسیری کے دوران انہوں نے صرف ایک بار بال ترشوائے۔ اکتوبر 1978ء میں انہوں نے جیل حکام سے حجام کیلئے کہا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی نگرانی میں ایک باربر کو، جس کا لباس اور بال کاٹنے کے اوزاروں وغیرہ کی صفائی کا خاص اہتمام کیا گیا تھا، سیکورٹی وارڈ بھجوایا گیا۔ بال کٹوانے کے بعد بھٹو صاحب نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ایک صد روپے اس کو انعام دیئے مگر اس نے پیسے نہ لینے پر اصرار کیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ بھٹو صاحب نے اس سے کہا کہ "تم غریب پاکستانیوں میں سے ایک ہو اور میری تو شاید جان بھی آپ لوگوں کیلئے قربان ہو گی۔ یہ تو بہت معمولی سی رقم ہے۔ یہ آج رات تمہارے بچوں کے کھانے کیلئے ہے"۔ اس پر حجام نے وہ رقم آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ قبول کر لی۔

بھٹو اور مذہب۔ بھٹو صاحب کے سیکورٹی وارڈ میں آنے سے پہلے ان کے سیل میں ایک عدد جائے نماز رکھ دی گئی تھی، لیکن کسی نے انہیں کبھی نماز پڑھتے نہ دیکھا۔ ان کے سیل میں آخری دن قرآن مجید کا

ایک چھوٹا سانسخہ جو تقریباً ایک انچ لمبا اور پون انچ چوڑا تھا' چاندی کے اتنے ہی سائز کے باکس میں بند پایا گیا' یہ شاید کسی نزدیکی رشتہ دار نے ان کو دیا ہو گا۔ مجھ سے بھٹو صاحب نے مذہب پر کبھی گفتگو نہیں کی۔ آخری ایّام میں جب کبھی میں نے اللہ تعالیٰ کی بڑائی 'اس کی رحمتوں اور بخششوں کا ذکر کیا تو انہوں نے کبھی بات آگے نہ بڑھائی۔

فروری یا مارچ 1979ء میں ایک دن مجھے کہنے لگے کہ دیکھو جیل سپرنٹنڈنٹ چودھری یار محمد مجھے نصیحت کرتا ہے کہ میں نماز پڑھوں اور خدا تعالیٰ سے معافی چاہوں۔ میرے خیال میں انہوں نے یہ سمجھا کہ جیل سپرنٹنڈنٹ ان کی ہمت اور حوصلہ توڑنا چاہتا ہے لیکن ماہ رمضان میں بھٹو صاحب نے تمام روزے باقاعدگی کے ساتھ رکھے۔ سحری اور افطار کا باقاعدہ بندوبست تھا۔ آخری رات میں نے ان کے گلے میں ایک تسبیح بھی دیکھی۔ میرے خیال میں بھٹو صاحب کا رجحان کچھ صوفی ازم کی طرف تھا اور وہ مذہبی رسومات اور نماز وغیرہ کا خاص خیال نہیں رکھتے تھے۔ مولوی صاحبان سے ان کو سخت چڑ تھی اور کہا کرتے تھے کہ پاکستان میں اسلام کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والے یہ ان پڑھ مولوی ہیں۔

جیل سپرنٹنڈنٹ کا خواب:۔ جون یا جولائی 1978ء کا ذکر ہے' میں چودھری یار محمد کے جیل دفتر میں ان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا سیکورٹی وارڈ کی چابیوں کا گچھا ان کے سامنے میز پر پڑا تھا جسے دیکھ کر وہ مسکرا دیئے اور کہنے لگے "کرنل صاحب! میں آپ کو ایک سچا خواب سناتا ہوں"۔ کہنے لگے "اوائل 1977ء میں' میں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو (اس وقت پاکستان کے وزیر اعظم) اس جیل (سنٹرل جیل راولپنڈی) میں تشریف لائے اور جیل کا معائنہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے خواتین کے وارڈ کے نزدیک مجھے چابیوں کا ایک گچھا تھما دیا۔ کہنے لگے صبح اٹھتے ہی میں نے اپنی بیگم کو بتایا کہ شاید وزیر اعظم جناب بھٹو صاحب مجھے بہت بڑی ذمہ داری سونپنے والے ہیں اور پھر میاں بیوی میں بہت کچھ قیاس آرائیاں ہونے لگیں"۔ خواب کا ذکر کرتے ہوئے چودھری یار محمد نے میز پر پڑا چابیوں کا گچھا اٹھایا اور کہا مجھے اب پتہ چلا ہے کہ اس خواب کا مطلب کیا تھا۔ مارشل لاء حکام نے سیکورٹی احکامات میں سیکورٹی وارڈ کی حفاظت جیل سپرنٹنڈنٹ کے ذمہ لگائی تھی۔ سیکورٹی وارڈ میں لگے ہوئے تمام تالوں کی چابیاں ہر وقت اپنے پاس رکھنا' تالوں کو کھولنا اور بند کرنا جیل سپرنٹنڈنٹ کا ذاتی فرض بنا دیا گیا تھا جس کو وہ اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ جب جیل سپرنٹنڈنٹ جیل سے غیر حاضر ہو گا تو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ یہ کام خود سرانجام دے گا۔ کئی وارڈروں کا ہمراہ ہونا ان صاحبان کو بے حد ناگوار لگتا تھا۔ یہ تھی وہ بھاری ذمہ داری جو جیل سپرنٹنڈنٹ کو بقول ان کے سچے خواب کے نتیجے میں انہیں سونپی گئی' لیکن انہوں نے اسے اپنی توہین کا باعث سمجھا۔

مزید احتیاطیں

جونہی بھٹو صاحب کی موت کی سزا کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی گئی حکومت نے ان کو راولپنڈی منتقل کرنے اور پنڈی جیل میں رکھنے پر سوچ بچار شروع کر دی۔ شروع شروع میں دس کور ہیڈکوارٹر نے اس کام کا تفصیل سے جائزہ لیا اور بھٹو صاحب کو جیل میں رکھنے کا منصوبہ بنایا۔ پھر ڈی ایم ایل اے نے اس کام کو سنبھال لیا۔ میں نے اس کتاب کے شروع میں تفصیلاً بیان کر دیا ہے کہ خواتین وارڈ کی کس طرح تجدید و ترمیم کی گئی تاکہ اسے بھٹو صاحب کیلئے سیکورٹی وارڈ بنایا جائے۔ اس کا سب سے بڑا مقصد ان کو جیل میں رکھتے ہوئے حفاظتی انتظامات کو پوری طرح مدِ نظر رکھنا تھا تاکہ کسی بھی حالت میں ان کو جیل سے باہر نکالنا یا اغوا کرنا ممکن نہ رہے' یا ان کی زندگی کو کسی طرح قبل از وقت ختم نہ کیا جا سکے۔ اس ایک شخص کیلئے جیل خانہ جات' پولیس اور فوج کی اتنی نفری مہیا کر دی گئی اور اتنے مضبوط دفاعی انتظامات کئے گئے جو کئی ہزار قیدیوں کے لئے کافی تھے۔ چونکہ ان تمام سیکورٹی انتظامات پر مجھے کنٹرول' نگرانی اور حفاظت پر تعینات کیا گیا تھا اسلئے مجھے بھٹو صاحب کے پھانسی لگنے تک ہر روز کسی نہ کسی مسئلے پر حکام بالا کی تسلی کیلئے جواب دہی کرنی پڑتی تھی۔ میں تقریباً اس ایک سال کے دوران انہی مسائل کے ساتھ سوتا اور جاگتا رہا۔

غیر معمولی احتیاطیں ۔ جیل کے اندر تو سنتریوں' واچ ٹاوروں' کانٹے دار تاروں' الارم بجنے کے آلات' فلڈ روشنیوں اور دوسرے سائنسی آلات وغیرہ کے علاوہ ان دفاعی ہتھیاروں کا جال بچھا دیا گیا تھا

جن کاذکر پہلے ہوچکا ہے مگر دوسری غیر معمولی احتیاطیں بھی کی گئیں جو درجِ ذیل ہیں

ا۔ سرنگ کے ذریعے فرار..... مجھے بار بار سرنگ کے ذریعے بھٹو صاحب کو باہر نکالنے کے بارے میں یاددہانی کرائی گئی۔ جس کیلئے ہمہ وقت' پولیس اور فوج سے جیل کے اردگرد رات کی گشت مقرر کرائی جاتی رہی چونکہ جیل کی مغربی سمت والی بڑی دیوار' جو ڈسٹرکٹ کورٹس اور ریلوے لائن کی طرف تھی' سیکورٹی وارڈ کے بالکل نزدیک تھی اور اس طرف سے کسی اقدام کا زیادہ خطرہ تھا' اس لئے اس علاقے کو عموماً رات کی گشت کا خاص علاقہ قرار دیا گیا۔ علاوہ ازیں ریلوے لائن جیل کی بڑی دیوار اور اس کے ساتھ جانے والی سڑک سے تقریباً بارہ تیرہ فٹ نیچے گہرائی سے گزرتی تھی اس لئے وہاں سے سرنگ کا لگانا اور زیادہ موزوں معلوم ہوتا تھا۔ ریلوے لائن سے مغرب کی جانب ڈسٹرکٹ کورٹس کے کچھ مکانات وغیرہ کے اندر سے بھی سرنگ کھودنا بعید از قیاس نہ تھا۔ جیل سے آرمی ہاؤس کی جانب جیل کا باغیچہ وغیرہ ہے' وہاں سے بھی سرنگ کا خدشہ محسوس ہوا۔ نالہ لئی جیل کے مشرق میں کچھ فاصلے پر واقع ہے' یہاں سے بھی سرنگ لگانے کا کچھ امکان ہو سکتا تھا۔ دن کی روشنی میں ان علاقوں کی خاموش دیکھ بھال کی جاتی تھی اور رات کے اندھیرے میں یہ علاقے گشت کرنے والوں کے پاؤں کی زد میں رہتے تھے۔ صبح سویرے ایک خاص گشت جو صرف دو تین جوانوں پر مشتمل ہوا کرتی تھی۔ ان علاقوں کا چکر لگاتی جو کسی بھی تبدیلی یا تازہ مٹی کا کوئی بھی نشان وغیرہ ڈھونڈ نکالنے کی ذمہ دار تھی حالانکہ سیکورٹی وارڈ کے فرشوں کو بھٹو صاحب کے آنے سے پہلے ہی آر سی سی یعنی لوہے' بجری' ریت اور سیمنٹ کی آمیزش سے تیار کیا گیا تھا پھر بھی کوئی رسک نہیں لیا جارہا تھا۔

ب۔ عوامی حملہ: Mob Attack حکومت عوام کے پُرہجوم حملے سے بھی متفکر تھی۔ پیپلز پارٹی اندر ہی اندر عوام کو اکسا کر جیل پر باہر سے حملہ آور ہو کر یا جیل کے اندر قیدیوں کی بغاوت کرا کے بھٹو صاحب کو بھگا لے جانے کی کوشش کر سکتی تھی۔ اس قسم کے اقدام سے نبٹنے کیلئے زمینی رکاوٹیں تیار کر لی گئی تھیں۔ پولیس کی کافی نفری موجود تھی۔ بھٹو صاحب کو پنڈی جیل منتقل کرنے سے پہلے ان تمام قیدیوں کو' جن کا کسی بھی طریقے سے پی پی پی کے ساتھ تعلق ہو سکتا تھا' دوسری جیلوں میں منتقل کر دیا گیا اور حسبِ ضرورت فوجی طاقت بھی کسی متوقع حملے کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار تھی۔

ج۔ کمانڈو قسم کا زمینی حملہ..... حکام کو سیکورٹی وارڈ پر کمانڈو قسم کے زمینی حملے کی تشویش بھی تھی جس سے بھٹو صاحب کو جیل سے آزاد کرایا جا سکتا تھا۔ ایک اچھا تربیت یافتہ کمانڈو جتھا جیل کے صدر دروازے اور ڈیوڑھی کے علاقے کو یا جیل کی دیوار کو کئی جگہوں پر دھماکہ خیز مادے سے اڑا کر جیل میں داخل ہونے کے بعد بھٹو صاحب کو اغوا کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اس قسم کے اندیشے کے پیشِ نظر ڈیوڑھی کے دونوں آہنی دروازے' جن کے درمیان تقریباً 25 - 30 فٹ فاصلہ تھا' ہر وقت مقفل رہتے تھے اور ان دونوں دروازوں پر الگ الگ سنتری تعینات رہتے تھے۔ ان دروازوں کے تالوں کی چابیاں ایک مخصوص

جگہ رکھی جاتی تھیں۔ راکاٹو کا آدمی ان آہنی دروازوں میں بنی ہوئی کھڑکی کو استعمال کرتا تھا اور آہنی دروازے ہروقت بند رہتے تھے۔ علاوہ ازیں ڈیوڑھی سے باہر سڑک پر ایک اور آہنی گیٹ بھی تھا جس کو ہر وقت سنتری کی نگرانی میں مقفل رکھا جاتا۔ سڑک سے جیل کی طرف آنے والی کسی بھی گاڑی کو کسی بھی حالت میں آنے نہ دیا جاتا' جب تک سنتری گاڑی کی تلاشی لے کر اطمینان نہیں کرلیتا اور مقصد معلوم کرنے کے بعد گاڑی کے داخلے کا تحریری اجازت نامہ نہ دیکھ لیتا۔ ان دنوں کوئی بھی گاڑی جیل کے اندر داخل نہ ہو سکتی تھی جب تک ڈیوٹی افسر سے اجازت حاصل نہ کرلی جاتی۔ یہ تمام **احتیاطیں** اس خدشہ کے پیش نظر کی جارہی تھیں کہ کہیں مخفی طور پر کسی گاڑی میں بارود (Explosive) موجود نہ ہو۔ کیونکہ ایسی صورت میں بارود والی گاڑی کو ڈیوڑھی کے اندر کھڑا کر کے پوری ڈیوڑھی کو دھماکے سے اڑا دینے اور منتظر کمانڈو جتھے کیلئے سیکورٹی وارڈ تک راستہ بنانے کے مقاصد پورے کرنے کا امکان نہ رہے۔

ان احتیاطوں کے علاوہ سیکورٹی وارڈ کے ارد گرد مشین گنیں اور راکٹ لانچر نصب تھے جن پر ہر وقت سنتری متعین رہتے تاکہ اس قسم کی کسی بھی کوشش کو غیر مؤثر بنا دیا جائے۔ اس کے علاوہ سیکورٹی وارڈ خاردار تاروں اور ان کے گچھوں کے بیچ اس طرح ڈال دی گئی تھی کہ بغیر دیکھے بھالے صرف فرشتے ہی ایسی جگہ پہنچ سکتے تھے۔

27 پنجاب کے جوان جیل کے شمالی احاطے میں مقیم تھے۔ ایمرجنسی کی حالت میں اس احاطے سے باہر بڑی سڑک پر نکلنے کیلئے صدر دروازے کو خاص طریقے سے مستور (Cover) کیا گیا تھا تاکہ کوئی شخص یا پارٹی اس دروازے کی گزر گاہ پر فائر کر کے اسے بند نہ کر سکے اور جیل کے کسی بھی حصے میں فوری کمک کو روک نہ سکے۔ علاوہ ازیں جیل اور اس احاطے کے درمیان جیل کی دیوار کو پھلانگنے کیلئے خاص قسم کی سیڑھیوں وغیرہ کا بھی بندوبست کیا گیا تھا تاکہ ناگہانی حالت میں اندر ہی اندر سے سیکورٹی وارڈ کے علاقے یا جیل کے کسی بھی دوسرے حصے میں فوری کمک پہنچ سکے۔

د۔ زمینی حملے کے ساتھ ساتھ ہوائی حملہ۔ زمینی حملہ کے ساتھ ساتھ ہوائی حملہ بھی دائرۂ امکان میں تھا حکام اُسکے متعلق بھی فکر مند تھے۔ سیکورٹی فورس کمانڈر کے تحت ہوائی جہازوں کو مار گرانے والی ایک بیٹری بھی جیل میں تعینات کر دی گئی تھی۔ اس بیٹری کی گنیں جیل کے اندر اور باہر اس طریقے سے نصب کی گئی تھیں کہ کوئی ہوائی جہاز یا ہیلی کاپٹر دُور دُور تک جیل کے نزدیک نہ پھٹک سکے۔ پی آئی اے' پی اے ایف اور آرمی ایوی ایشن بیس **دھمیال** کو آگاہ و خبردار کر دیا گیا تھا کہ جیل کے علاقے یا اس کے نزدیک اڑان نہ کریں۔ ادھر انٹی ایئر کرافٹ گنوں کو حکم دیا گیا تھا کہ اگر کوئی جہاز یا ہیلی کاپٹر جیل کے اوپر آئے تو اسے فوراً فائر کر کے گرا دیا جائے۔ بھٹو صاحب کی اسیری کے دوران دو مرتبہ ایک جہاز نے غلطی سے جیل کے اوپر پرواز کی لیکن دونوں مرتبہ خوش قسمتی سے میں خود جیل میں موجود تھا اور حالات کو دیکھتے ہوئے گنرز کو فائر کرنے سے روک دیا ورنہ شاید کوئی کم تجربہ کار ڈیوٹی افسر ایسا فیصلہ نہ کر سکتا اور غلطی سے پرواز

کرنے والے جہاز کو پنڈی شہر پر گرا دیا جاتا جو اخبارات وغیرہ کیلئے اچھا خاصا مواد پیدا کر دیتا۔ ان مواقع کے بعد ہوابازوں کو سخت تنبیہ کر دی گئی تھی۔

سیکورٹی وارڈ کے ارد گرد اور جیل میں دوسری جگہوں میں چھتوں پر زیادہ تر چوکیاں کھلی ہوا میں تھیں۔ ہوائی جہاز کے ذریعے ان چوکیوں پر راکٹوں وغیرہ سے گیس کے حملے کا خطرہ بھی لاحق تھا۔ جس سے سنتری اور دوسرے جوان تھوڑی یا زیادہ دیر کیلئے بے ہوش کئے جا سکتے تھے۔ ایسی حالت میں الارم اور گیس ماسک کے استعمال اور فوری امدادی پلان کا بھی سوچ لیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں متبادل مورچہ بندی بھی تیار کر لی گئی تھی۔

ہ۔ چھاتہ بردار حملہ: چھاتہ بردار حملے کے متعلق پہلے ہی پلان میں سوچ لیا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ 3 ایف ایف رجمنٹ کی ایک کمپنی سیکورٹی فورس کمانڈر کو اس قسم کے حملے کی صورت میں مدد کیلئے دیدی گئی تھی۔ 3 ایف ایف بٹالین ان دنوں وزیراعظم کی رہائش گاہ کے متعلقہ علاقے میں بھیج دی گئی تھی اور اس کی ایک کمپنی کو یہ فرض سونپا گیا تھا کہ چھاتہ بردار کوشش کی صورت میں وہ اسے ناکام بنائے گی۔

و۔ ماسک یا بُرقع کا استعمال: بھٹو صاحب کی پہلی بیوی امیر بیگم صاحبہ پردہ دار خاتون ہیں۔ وہ بھی راولپنڈی جیل میں ان سے ملنے آیا کرتی تھیں۔ وہ ہمیشہ باپردہ ہو کر یعنی برقع پہن کر آیا کرتی تھیں اور واپس بھی اسی طرح پردہ کر کے جایا کرتی تھیں۔ مجھے خبردار کیا گیا کہ ایسی ملاقات میں بھٹو صاحب اپنی بیگم کا برقع اوڑھ کر جیل سے باہر نہ نکل جائیں اور بیگم، بھٹو صاحب کے چہرے کا ماسک اپنے منہ پر پہن کر ان کی جگہ سیل میں بیٹھ جائیں۔ ہر ایسی ملاقات کے فوراً بعد ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جا کر بھٹو صاحب کے ساتھ بات چیت کر کے یہ یقین کر لیتا تھا کہ واقعی بھٹو صاحب خود سیل میں موجود ہیں۔ اس یقین دہانی کے بعد ہی ان کی بیگم صاحبہ کو جیل کے احاطے سے باہر نکالا جاتا تھا۔

ز۔ ہائی جیک یا یرغمالی بنانے کی کوشش: سیکورٹی فورس کے کسی اہم شخص کو ہائی جیک کر کے یرغمالی بنالیا جائے تو اس صورتحال سے نمٹنے کیلئے بھی مختلف طریقے سوچ لئے گئے تھے۔ چونکہ میں ہی زیادہ تر جیل کے مختلف حصوں میں آتا جاتا رہتا تھا اس لئے مجھے محتاط کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح اگر مارشل لاء حکام میں سے کسی خاص آدمی کو یرغمالی بنا کر بھٹو صاحب کی رہائی کا مسئلہ کھڑا ہوا تو بھی ایک خاص پلان سوچ لیا گیا تھا۔

ح۔ میری نگرانی: بھٹو صاحب تو جیل میں بند تھے ہی لیکن ہمارے انٹیلی جنس والے میری پوری پوری نگرانی میں لگے ہوئے تھے۔ میرا گھر، ٹیلیفون، میرے ملاقاتی، میری حرکات و سکنات، ہر چیز کی نگرانی ہو رہی تھی۔ شروع شروع میں، مَیں نے اچانک محسوس کیا کہ میرا ٹیلیفون ٹیپ ہو رہا ہے چونکہ میں نے ایڈوانس انٹیلی جنس کورس (Advance Intelligence Course) کیا ہوا تھا اور پھر

ملٹری انٹیلی جنس میں تین سال اور ایس ایس جی میں سات سال تک رہا اور اس میں خاصا وقت امریکن سپیشل فورسز کے ساتھ بھی گزارا تھا' اس لئے مجھے فوراً معلوم ہو گیا کہ میرا ٹیلیفون سنا جا رہا ہے۔ میں نے اپنے گھر بھی بتا دیا تھا کہ کسی قسم کی فالتو بات چیت ٹیلیفون پر نہ کی جائے۔ ان دنوں جب بھی میں گاڑی میں باہر نکلتا تو مجھے معلوم ہو جاتا کہ میرا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ میرے گھر پر بھی اسی قسم کی نگرانی ہو رہی تھی۔ ہم بہت محتاط ہو گئے۔ ادھر میرے پرانے دوستوں نے بھی' جو اس وقت آئی ایس آئی اور آئی بی میں ڈیوٹی کر رہے تھے' میری پرانی یادیں تازہ کرنی شروع کر دیں اور مجھ سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری کر دیا۔ مجھے پتہ تھا کہ چونکہ میں ایک نازک کام سرانجام دے رہا ہوں اسلیئے حکومت یقیناً چاہے گی کہ میری نگرانی کی جائے تاکہ میرے اندر کوئی غلط رغبت پیدا نہ ہو۔ بہرحال ایسی حالت میں انسان اپنی تمام آزادی کھو بیٹھتا ہے اور میری حالت بھی ایک قیدی سے کسی طرح کم نہ تھی۔ میں نے اپنی بیگم کو بتا دیا تھا کہ کوئی شخص بجلی یا ٹیلیفون وغیرہ ٹھیک کرنے ہمارے گھر میں اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک میں خود گھر پر موجود نہ ہوں تاکہ کسی قسم کا کوئی مخفی آلہ وغیرہ ہمارے گھر نصب نہ کر دیا جائے۔ میں نے ویسے بھی اپنے گھر کی اینٹی بگنگ (Anti Bugging) خود کر لی۔

ط۔ بھٹو صاحب کو جیل سے نکالنے کیلیئے تین کا ہونا ضروری تھا

حکام کو یہ اندیشہ تھا کہ میں خود یا ایس ایم ایل اے یا کوئی اور افسر بھٹو صاحب کو جیل سے کسی منصوبے کے تحت یعنی پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر باہر نہ نکال دے۔ اسلیئے یہ حکم جاری کیا گیا کہ جب تک سیکورٹی بٹالین کمانڈر' ایس ایم ایل اے اور ڈی ایم ایل اے تینوں کے تینوں حاضر نہ ہوں بھٹو صاحب کو اچانک جیل سے نہیں نکالا جائے گا۔ ایک جانے بوجھے پلان کے تحت مثلاً اگر بھٹو صاحب کو سپریم کورٹ میں حاضری دینی ہو تو بہت پہلے احکامات ڈی ایم ایل اے' ایس ایم ایل اے اور مجھے مل جائیں گے لیکن انہیں اچانک جیل سے کسی اور جگہ منتقل کرنے کے لئے ہم تین کا ہونا ضروری تھا۔ البتہ اگر جیل میں آگ لگ جائے یا اسی قسم کی کوئی ناگہانی صورت پیدا ہو جائے تو کم از کم ہم میں سے دو افسر حاضر ہوں گے اور مجھے تیسرے کی طرف سے کوڈ کے ذریعے حکم دیا جائے گا کہ بھٹو صاحب کو فلاں جگہ منتقل کر دیا جائے۔ ان جگہوں کا "ناگہانی پلان" میں تفصیلاً ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح اگر حکام بالا سے کسی کو یرغمالی بنا لیا جاتا ہے اور مجھے ٹیلیفون پر بھٹو صاحب کو کسی اور جگہ منتقل کرنے کو کہا جاتا ہے تو بھی ایسی صورت میں مجھے ٹیلیفون پر دیئے گئے حکم کو نہ ماننے کی واضح ہدایت کر دی گئی تھی۔ مجھے یہ بھی صاف صاف بتا دیا گیا تھا کہ میں پراپر چین آف کمانڈ (Proper Chain of Command) یعنی میں ایس ایم ایل اے اور ڈی ایم ایل اے کے علاوہ اس معاملے میں کسی اور کا حکم ہرگز نہیں مانوں گا' چاہے وہ کوئی بھی حیثیت یا اختیار رکھتا ہو۔ ایک دفعہ مجھے ڈی ایم ایل اے کے دفتر طلب کیا گیا اور جنرل صاحب نے مجھے بتایا کہ کسی پارٹی میں پی ایل او (PLO) کے کچھ آدمیوں نے شیخی مار کر کہا ہے

کہ وہ بھٹو صاحب کو جب چاہیں جیل سے نکال کر پاکستان سے باہر لے جاسکتے ہیں۔ میں نے انہیں جواب دیا کہ اگر یہ لوگ اس قابل ہوتے تو آج اسرائیلی ان کے گھر میں نہ بیٹھے ہوتے۔ بہر حال مجھ سے ایسی کوشش کو ناکام بنانے کے متعلق سوال وجواب کئے گئے اور زیادہ مستعد رہنے کیلئے کہا گیا۔

ی۔ تمہاری قیمت کیا ہے ؟: ایک دن کا ذکر ہے کہ جب میں ڈی ایم ایل اے کے دفتر گیا تو جنرل شاہ رفیع عالم نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا۔ Rafi, What is your price ? (رفیع تمہاری کیا قیمت ہے ؟) چونکہ انہوں نے مجھ سے یہ سوال اچانک پوچھا میں اسے سمجھ نہ سکا۔ میں نے وضاحت چاہی کہ جناب آپ کا کیا مطلب ہے ؟ تب انہوں نے مسکراتے ہوئے مجھے بتایا کہ فلاں بریگیڈیئر' جو اسپیشل سروس گروپ میں نوکری کر کے اب فوج سے جاچکے ہیں' ان سے ایک بہت بڑی رقم دینے کا وعدہ کیا گیا ہے بشرطیکہ وہ بھٹو صاحب کو جیل سے اغوا کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ یہ رقم کئی ملین ((Million)) تھی۔ میں نے جنرل صاحب کو بتایا کہ جہاں تک میرا فرض ہے اس کو کوئی رقم نہیں خرید سکتی اور جہاں تک احتیاطوں کی ضرورت ہے وہ بھی حد سے زیادہ کی جارہی ہیں۔ انہوں نے مجھ سے اس معاملے میں کچھ مزید بحث کی جس سے وہ پوری طرح مطمئن ہو گئے۔

ک۔ ناگہانی پلان: .... حکومت عوام کے گھیراؤ یا فسادات وغیرہ کے متعلق کافی متفکر تھی۔ جیل میں اچانک آگ لگ جانے کی حالت میں بھی بھٹو صاحب کی منتقلی کا پلان بنایا گیا تھا۔ ایسی ناگہانی حالت میں ان کو مندرجہ ذیل جگہوں پر لے جانے کا انتظام کیا گیا

- ..... اچانک اور ناگہانی حالت میں اگر چھاؤنی کا علاقہ اور راستہ بے خطر ہو تو بھٹو صاحب کو 27 پنجاب کے ہیڈ کوارٹر ویسٹ رج لے جانا تھا اس مقصد کیلئے جگہ تیار تھی اور ہر طرح کی حفاظت کا بندوبست کر لیا گیا تھا۔ اس کیلئے کوڈ ورڈ "سعید کے گھر" کا تھا۔ میجر سعید (بعد ازاں لیفٹیننٹ کرنل) میرے ڈپٹی کمانڈر تھے۔

- ..... اگر چھاؤنی یا ویسٹ رج کا علاقہ کسی وجہ سے غیر محفوظ ہو تو پھر بھٹو صاحب کو پرائم منسٹر ہاؤس کے علاقے میں 3 ایف ایف رجمنٹ کے آفیسر میس کے ایک خاص کمرہ میں لے جایا جانا تھا۔ جس کیلئے "یعقوب کے گھر" کا کوڈ مقرر کیا گیا تھا۔

- ..... اگر مندرجہ بالا دونوں راستے خطرناک ہوں تو بھٹو صاحب کو کوڈ "ڈبل بیڈ" پر جیل سے دس کور ہیڈ کوارٹر آفیسر میس چکلالہ میں منتقل کرنا تھا۔

اس ناگہانی پلان پر عمل کرنے کیلئے کئی بار ریہرسل کی گئی تھی۔ منتخب جوان گاڑیاں اور ہتھیار وغیرہ کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ایسی ناگہانی حالت میں سیڑھیاں' سٹریچر' دھوئیں کے بم اور دوسرا سامان بھی فراہم کر دیا گیا۔ دراصل بھٹو صاحب کی اسیری کے دوران شروع سے آخیر تک احتیاطوں اور مزید احتیاطوں کا سلسلہ جاری رہا اور ہر روز نت نئی پیش بندیاں اور نت نئے پلان بنتے رہے' حتیٰ کہ انہیں پھانسی لگا دیا گیا۔

دو قیدیوں کا جیل سے فرار۔ سیکورٹی وارڈ کی حفاظت کیلئے تو دنیا بھر کی احتیاطیں عمل میں لائی گئیں لیکن باقی جیل کی حالت وہی رہی جو عام حالات میں ہوا کرتی ہے۔ دسمبر 1978ء کی ایک رات دو قیدی' جن میں سے ایک آزاد کشمیر اور دوسرا ضلع راولپنڈی سے تعلق رکھتا تھا' پنڈی جیل سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اگلے دن جب میں جیل کے دفتر پہنچا تو میں نے سپرنٹنڈنٹ اور جیل کے سٹاف کو کچھ خاموش اور فکر مند پایا۔ میرے پوچھنے پر مجھے نہ بتایا گیا۔ میں فوراً سیکورٹی وارڈ گیا اور بھٹو صاحب کو سویا ہوا پایا۔ کچھ دیر بعد مشقتی نے انہیں صبح کی چائے لا کر دی اور میں ان سے علیک سلیک کے بعد آپریشن روم میں ڈیوٹی افسر کے پاس گیا۔ وہاں سے ہمارے انٹیلی جنس این سی او نے مجھے بتایا کہ رات دو قیدی جیل سے فرار ہو گئے ہیں۔ میں نے جیل سپرنٹنڈنٹ سے پوری پوچھ گچھ کرنے پر معلوم کیا کہ دو قیدی جیل کے مشرقی حصے کی دیوار کے نیچے بارش کے پانی کے اخراج والے پائپ میں سے نکل کر فرار ہو گئے ہیں۔ میں نے جا کر اس جگہ کا معائنہ کیا لیکن مجھے یقین نہ آیا کہ ایک آدمی آٹھ نو انچ کے پائپ سے نکل سکتا ہے۔ بہر حال جیل حکام نے انہیں اسی نالی میں سے نکال دیا! اسی دن اس نالی کے دونوں سروں کو لوہے کی سلاخوں سے بند کر دیا گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ قیدی جیل کی دیوار پھلانگ کر شمال مشرقی سمت سے نکل بھاگے اور غالباً وہ ملٹری ڈیری فارم کی طرف سے نکلے تھے۔

اگلے روز یہ خبر اخبارات میں چھپی۔ حکامِ بالا کو ایسی خبر پڑھ کر کافی تشویش لاحق ہوئی۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ جیل کے اندر اور ارد گرد اتنے سخت انتظامات کے باوجود قیدی بھاگ نکلنے میں کس طرح کامیاب ہوئے؟ میں نے جیل کے اندر کی سیکورٹی کی تفصیل بتائی اور یہ بھی بتایا کہ جہاں تک سیکورٹی وارڈ کا تعلق ہے وہاں کوئی ایسا خدشہ نہیں البتہ جیل کے کاروبار سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ مجھے پھر بھی تنبیہ کی گئی کہ جیل کے متعلق باہر پولیس پٹرول کو مزید بہتر بنایا جائے تاکہ جیل کے ارد گرد سیکورٹی اور زیادہ مؤثر رہے۔

جیل اسٹاف کی کافی کھچائی ہوئی جس کا اثر چند دن تک رہا مگر پھر وہی روش! بہر حال جیل کے اندر اور باہر ایسے انتظامات کر دیئے گئے تاکہ پھر کسی قیدی کو بھاگنے کی جرأت نہ ہو۔

بھٹو صاحب کی باتیں

میں تیسرے باب ''ابتدائی ایام'' میں ''میری بعد کی ملاقاتیں'' کے عنوان میں لکھ چکا ہوں کہ بھٹو صاحب کے ان انکشافات کا جو انہوں نے میرے ساتھ کئی ملاقاتوں کے دوران باتوں باتوں میں کئے' ذکر کروں گا۔ جیل ڈیوٹی کے دوران مجھے جو لمحات سب سے زیادہ قیمتی محسوس ہوئے وہ تھے بھٹو صاحب کی باتیں سننے والے لمحات۔ ان باتوں میں کہاں تک بھٹو صاحب نے صاف گوئی سے کام لیا یا ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے کچھ کہہ گئے اس کے متعلق میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ فیصلہ ہر پڑھنے والے کو خود کرنا ہو گا۔ جہاں تک مجھ سے ہو سکا ہے میں ان کی باتوں کو ریکارڈ پر لا رہا ہوں تاکہ میری طرح تمام پڑھنے والے بھی ان کی باتوں سے مستفید ہو سکیں۔ اسیری کے دوران وہ میرے ساتھ ہمیشہ انگریزی زبان میں بات چیت کیا کرتے اور میں بھی حتی الوسع ان کے ساتھ اسی زبان میں گفتگو کرتا۔ ان کے انکشافات مندرجہ ذیل تھے۔

پاکستان اور ایٹمی طاقت:۔ بھٹو صاحب نے پنڈی جیل میں مجھ سے اس موضوع پر چند مرتبہ گفتگو کی۔ کبھی وہ پاکستان اور بھارت کے تعلقات کے سلسلے میں اس موضوع کو زیر بحث لائے۔ کبھی پاکستان کی اشد ضرورت و ترقی کو موضوع بناتے ہوئے اس طاقت کا ذکر کیا۔ امریکہ' اسرائیل اور مغربی ممالک کی پالیسیوں کے تحت پاکستان کی بدقسمتی کا ذکر کیا اور پاکستان کی بقا کی خاطر بھٹو صاحب نے جب امریکہ کی وارننگ کو بھی مسترد کر دیا تو ان کو اس کال کوٹھڑی تک پہنچا دیا گیا۔

دو تین مرتبہ انہوں نے پاکستان ہندوستان کا موازنہ کچھ اس پیرائے میں کیا کہ ہندوؤں کی کوشش تھی کہ پاکستان وجود میں نہ آئے تاکہ وہ اکھنڈ بھارت کا خواب پورا کر سکیں۔ پاکستان بننے کے بعد پہلے تقریباً تیس سالوں میں حکومتِ ہند نے دل سے کبھی پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا اور اس وقت سے ہندو حکومت پاکستان کو ختم کرنے کے درپے رہی ہے۔ پھر جب کبھی تیسری دنیا کے ممالک میں جھگڑے اٹھتے ہیں تو بدقسمتی سے سپر پاورز بھی طاقتور ملک یا اپنے مفاد کا ساتھ دیتی ہیں۔ یہ طاقتیں اسلام کی ہمیشہ مخالفت کرتی رہی ہیں۔ ہندو کا فلسفہ یہ ہے کہ برابر یا اپنے سے طاقتور کے ساتھ دوستی کرو اور کمزور کے ساتھ زبردستی۔ بدقسمتی سے ہمارے وسائل ہندوستان کے برابر نہیں اور ہم فوجی لحاظ سے انکی برابری کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتے بلکہ ہندوستانی وسائل، صنعت و حرفت، مالی اور فوجی لحاظ سے روز بروز مزید ترقی کرتے چلے جا رہے ہیں۔ جبکہ ہم اس لحاظ سے اپنا تناسب برقرار رکھنے میں بھی مشکلات سے دوچار ہیں۔ 1974ء میں ہندوستان نے ایٹمی دھماکہ کر کے ایٹمی ٹیکنالوجی میں دنیا کی صفِ اوّل کی اقوام میں اپنا مقام حاصل کر لیا ہے۔ ادھر مشرقی پاکستان کو ہم سے زبردستی الگ کر کے ہم پر واضح کر دیا ہے کہ جب بھی ہم کمزور ہوئے ہم پر چڑھائی (Walk Over) کر کے ہمیں اپنا غلام بنانے کی کوشش کرے گا اور اس طرح ہم سے بارہ تیرہ سو سالہ تاریخ کا بدلہ لے گا۔ اسلئے ہماری سیکورٹی کا واحد ذریعہ ایٹمی طاقت (Nueclear Deterrence) کے حصول میں ہے جو ہندوستان کو ہم سے باعزت طریقے سے رہنے پر مجبور کر دے گا۔ اگر جغرافیائی اور فوجی حکمت عملی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو پاکستان ایٹمی طاقتوں میں گھرا ہوا ہے۔ ہم روس، چین، ہندوستان اور امریکہ، جو بحرِ ہند میں سب سے بڑی ایٹمی طاقت ہے، میں محصور ہیں۔ اس علاقے میں سوائے چین کے جس سے ہمارے انتہائی دوستانہ تعلقات ہیں باقی سب ہمارے خلاف ہیں اور ایسے کڑے حالات میں وہ کبھی ہمارا ساتھ نہیں دیں گے۔

بھٹو صاحب نے فرمایا "میں پاکستان کو اس قابل بنانے میں تقریباً کامیاب ہو چکا تھا۔ بھارت کو تو مخالفت کرنی ہی تھی کیونکہ میں ان کے مقاصد کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ کھڑی کر رہا تھا لیکن امریکہ اور روس کے حلیفوں نے اپنی عالمی پالیسی کی بنا پر میری سخت مخالفت کی۔ شروع میں امریکہ نے مجھے لالچ دیا پھر کہا کہ اپنے ہاتھ کیوں جلاتے ہو لیکن میں جب قوم اور ملک کی خاطر اپنے مشن پر ڈٹا رہا اور ہمارے اس دوست ملک نے دیکھا کہ میں اپنی دُھن میں مست ہوں تو اپنے قابل وزیر خارجہ ہنری کیسنجر کے ذریعے مجھے آخری وارننگ دی اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمہیں باقی دنیا کیلئے نمونہ بنا دیں گے تاکہ اس قسم کی جرأت -(Venture) کا آئندہ کوئی سوچ بھی نہ سکے اور پھر کرنل رفیع! آپ کے جنرل کے ذریعے مجھے اس حالت (سیکورٹی وارڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) تک پہنچا دیا۔

ایک اور موقع پر بھٹو صاحب نے امریکہ کو پاکستان اور عالم اسلام کا یہودی لابی کی وجہ سے دشمن نمبر ایک قرار دیا اور صاف الفاظ میں کہا کہ میں (مسٹر بھٹو) پاکستان کو عظمت اور قومی عزت

(Glory and self respect) کے لحاظ سے صف اول میں لانا چاہتا تھا۔ اگر مجھے تھوڑا ساوقت اور مل جاتا تو میں اس مشکل مرحلہ کو سر کر لیتا۔ کہنے لگے مجھے اپنے آپ پر فخر ہے اور ایک نہ ایک دن ہماری قوم کو احساس ہو گا۔ انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا، کرنل میں ناممکن کو ممکن بنانے والا تھا۔ مگر ان جرنیلوں میں اتنی ہمت، دور بینی اور قوم پرستی کہاں؟ کہ میرے تقریباً مکمل کام کو آگے بڑھائیں۔ ایک دو لمحے سوچنے کے بعد کہنے لگے "ان کو ایسا کرنے ہی کون دے گا۔ سی آئی اے تو اس وقت دنیا کی تمام حکومتوں سے زیادہ مضبوط اور طاقتور ادارہ ہے"۔ چند لمحے خاموشی کے بعد کہنے لگے "آج تمہارا جنرل امریکیوں کا منظورِ نظر ہے لیکن کل جب اس نے ہنر ماسٹرز وائس پر توجہ نہ دی تو اس کا انجام بھی وہی ہو گا جو اس طرح کے سامراجی ایجنٹوں کا ہوا کرتا ہے"۔

بھٹو صاحب نے مجھ سے چند مرتبہ مختلف اوقات پر پاکستان، امریکہ تعلقات پر بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ یہودی اثر ہر امریکی حکومت پر بہت زیادہ رہے گا اسلئے عالمِ اسلام اور خاص کر پاکستان کا امریکہ کبھی بھی خیر خواہ نہیں رہے گا اور کسی بھی پاکستانی قومی لیڈر کو نہیں چاہے گا۔

بھٹو صاحب کا پاکستانی قوم کیلئے سب سے بڑا تحفہ:۔ ایک ملاقات کے دوران میرے پوچھنے پر بھٹو صاحب نے فرمایا کہ ان کا پاکستانی قوم کیلئے ایک بڑا کام یہ تھا کہ انہوں نے اپنی قوم کو سیاسی بیداری (Political Awareness) سے ہمکنار کیا۔ میں نے اپنے غریب عوام (Down Trodden Lot) کو احساس محرومی دلایا۔ کہنے لگے کرنل "میں رہوں یا نہ رہوں لیکن اب کوئی طاقت ہمارے غریب عوام سے اس احساس کو کبھی نہ چھین سکے گی"۔ پھر کہا میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرا قوم کو "جو زیادہ تر غریب عوام پر مشتمل ہے" سب سے بڑا تحفہ رہے گا۔

جنرل ضیاء الحق صاحب کو چیف آف آرمی سٹاف کیسے بنایا گیا:۔

جب میری اور بھٹو صاحب کی انڈر سٹینڈنگ (Understanding) کافی اچھی ہو گئی تو ایک دن میں نے ہمت کر کے ان سے دریافت کیا کہ جناب آپ نے جنرل ضیاء الحق صاحب کو فوج کا سربراہ کیسے چن لیا۔ انہوں نے تھوڑی دیر سوچ کے بعد فرمایا، بھئی یہ جنرل ٹکا خان کی سفارش تھی۔ ٹکا صاحب نے سفارش کی کہ ان کے بعد جنرل ضیاء الحق کو ان کا جانشین بنایا جائے۔ جنرل ٹکا خان کا خیال تھا کہ جنرل ضیاء الحق ایک مذہبی قسم کا شخص ہے اور فوج کا سربراہ ہونے کے بعد وہ اپنی نمازوں وغیرہ میں مشغول رہے گا اور حکومت کیلئے سیاسی معاملات میں کوئی مشکلات پیدا نہ کرے گا۔ بھٹو صاحب کے اس بیان کی صداقت اللہ تعالٰی ہی جانتا ہے کیونکہ ان کے پھانسی لگنے کے کافی عرصہ بعد جنرل ٹکا خان صاحب نے ایک اخباری بیان کے مطابق یہ کہا تھا کہ انہوں نے جنرل ضیاء الحق کو فوج کا سربراہ بنانے کی مخالفت کی تھی۔

بھٹو صاحب نے اسی ملاقات کے دوران مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ جنرل عبدالمجید ملک بھی چیف آف آرمی سٹاف کے عہدے کیلئے ایک موزوں شخص تھے۔ کہنے لگے جنرل عبدالمجید ملک ایک روشن دماغ، عقل مند

اور قابل جنرل تھے لیکن وہ بدقسمتی سے اس عہدے کو نہ پا سکے۔ حالانکہ انہوں (مسٹر بھٹو) نے کافی چاہا لیکن قسمت نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ میں نے بھٹو صاحب کو جنرل عبدالمجید ملک کے ماتحت ایس ایس جی (Special Service Group) میں سروس کرنے کا حال سنایا اور ان کی قیادت میں 1965ء کی جنگ کا ذکر بھی کیا اور بعد میں 1971ء کی جنگ میں ان کے کارہائے نمایاں کی تفصیل بھی بیان کی تو کہنے لگے کہ وہ ایک شائستہ اور سمجھدار جنرل ہیں اور فوج کے ایک اچھے سربراہ ثابت ہوتے لیکن ایسا نہ ہوسکا۔

بھٹو صاحب کو کبھی تختۂ دار پر چڑھنے کا خیال تک نہ آیا تھا:۔

بھٹو صاحب اپنی زندگی کے آخری 323 دن راولپنڈی جیل میں قید رہے۔ اس دوران میرے خیال میں ان کو کبھی یہ یقین نہ آیا تھا کہ انہیں تختۂ دار پر چڑھا دیا جائے گا۔ ان کے وکلاء، فیملی ممبرز اور جیل میں ملنے والے تقریباً تمام لوگوں نے ان سے اس مقدمے کے متعلق ہمیشہ یہی کہا کہ یہ صرف سیاسی کھیل تماشہ ہے۔ انہیں بیرونی ممالک کے سربراہوں اور کئی دوسری شخصیات کے جنرل ضیاء الحق اور ان کی حکومت پر اثر و رسوخ کا علم بھی تھا۔ علاوہ ازیں بھٹو صاحب کے کچھ بیرونی دوستوں نے جنرل ضیاء الحق صاحب سے ان کی معافی کا وعدہ تک بھی لے لیا تھا جو میرے خیال میں بھٹو صاحب کے علم میں بھی لایا گیا تھا۔ مقدمہ کی اپیل کے آخری چند ماہ کے دوران جب مجھے یہ علم ہوا کہ حکومت بھٹو صاحب کو پھانسی دینے پر تلی ہوئی ہے تو میں نے ان کو اپنا مخلصانہ مشورہ دیا مگر انہوں نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ یہ مقدمہ جھوٹا اور بناوٹی ہے اور ان کو کچھ پروا نہیں کہ اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے مگر وہ جھوٹ کے آگے کبھی سر نہیں جھکائیں گے۔ ان کے اس بہادرانہ جواب نے ان کی عزت میرے دل میں اور بڑھا دی۔ بلکہ جب تین اپریل 1979ء کی شام بھٹو صاحب کو سرکاری طور پر یہ بتایا جا رہا تھا کہ ان کو آخری فیصلہ کے مطابق اب پھانسی دی جا رہی ہے (پوری تفصیل باب " آخری لمحات " میں دی گئی ہے۔) تو بھٹو صاحب اس موت کے پیغام پر مسکرا رہے تھے۔ اس وقت میں آپے سے باہر ہو گیا تھا اور ان کو پھانسی دی جانے پر ایک زبردست اضطراب کی حالت میں تھا۔

چونکہ میں نے یہ ڈرامہ شروع سے آخیر تک دیکھا ہے اسلئے پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ بھٹو صاحب کو تختۂ دار پر چڑھنے کا کبھی خیال تک نہ آیا تھا۔

میرا مخلصانہ مشورہ:۔ بھٹو صاحب نے راولپنڈی جیل میں قید کے دوران مجھے یہ تاثر دیا کہ وہ اس کیس کے متعلق ذرہ برابر بھی فکر مند نہیں ہیں اور جب بھی میں نے ان سے اس سے متعلق کچھ کہا تو انہوں نے یہی جواب دیا کہ چونکہ یہ بناوٹی کیس ہے اس لئے وہ کیوں فکر مند ہوں؟ جب ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے لگے اور مجھے یقین ہو گیا کہ وہ میری عزت کرتے ہیں اور وہ یہ سمجھ گئے کہ میں ان کا دل سے خیر خواہ ہوں تو میں نے ان سے چند مرتبہ کہا کہ انہیں اس مقدمے کو اتنی لاپرواہی سے نہیں لینا چاہئے مگر انہوں نے

ہمیشہ یہی جواب دیا کہ ان کا اس میں ذرہ بھر قصور نہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ بہت بڑے سیاستدان ' مدبر اور معاملہ فہم ہیں اور انہیں اپنی اس خداداد قابلیت کو استعمال کرتے ہوئے اس حالت سے باہر نکلنے کی کوشش کرنی چاہئے مگر انہوں نے الٹا فوجی جنتا کو ہی اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ میں نے ان سے کہا کہ جناب اگر آپ یہ بیان دیں کہ آپ ان جرنیلوں سے سٹاف کالج کی ٹٹیاں صاف کروائیں گے اور کوئی بھی آئین سے انحراف کرنے سے بچ نہیں سکے گا تو آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ لوگ آپ کو ایسے ہی چھوڑ کر اپنی مصیبت خود مول لیں گے؟ بہرحال میں نے چند مرتبہ صدقِ دل سے ان سے عرض کیا کہ انہیں کسی نہ کسی طریقے سے اس حالت سے باہر نکلنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ممکن ہے میرے دلائل سے وہ قائل نہ ہو سکے ہوں۔ بہرحال انہوں نے ہر بار مجھے یہی جواب دیا کہ اس مقدمے میں وہ بے قصور ہیں اور وہ کیوں اپنی عزّتِ نفس کا سودا کریں۔ ممکن ہے ایسا راستہ اختیار کرنے میں ان کا سیاسی کردار (Political Career) خراب ہوتا ہو یا انہیں یقین ہو کہ وہ کبھی ایسی سزا نہ پائیں گے۔

کچھ شخصیات پر بھٹو صاحب کے خیالات:۔ ہماری ملاقاتوں کے دوران بھٹو صاحب نے وقتاً فوقتاً کچھ شخصیات پر تبصرے کئے تھے جو ذیل میں درج کرتا ہوں۔

ا) فیلڈ مارشل ایوب خان:۔ ایک دن کہنے لگے کہ ایوب خان صاحب کئی نادر اور غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ دراز قد' خوبصورت اور نقش پذیر شخصیت کے مالک تھے لیکن وہ بحرانوں (Crisis) میں کمزور دل کے مالک تھے۔ (انہوں نے اپنے ہاتھ کے انگوٹھے اور کلمے والی انگلی کے درمیان کوئی انچ بھر کا فاصلہ رکھ کر یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تھی) چونکہ بھٹو صاحب کو جیل میں سوائے خوراک اور ادویات وغیرہ کے باقی کسی قسم کی کوئی اشیاء نہ مل سکتی تھیں۔ کہنے لگے کہ ایک دفعہ ایوب خان صاحب نے ان کو جیل میں وسکی کی بوتلوں کا ایک کریٹ بھیجا تھا اور چونکہ انہیں ایک معمولی احسان بھی ہمیشہ یاد رہتا ہے' اس تحفے کی یاد بھی رہی۔ جب وہ خود حکومت میں واپس آئے تو ایوب خان صاحب کے فیملی ممبران کو ٹیکس سے بچنے کے الزام میں دھر لیا گیا تھا لیکن انہوں نے اس احسان کو یاد کرتے ہوئے ان کے فیملی ممبران کی مدد کی اور اس مصیبت سے ان کی خلاصی کروائی تھی۔

بھٹو صاحب کو ایوب خان صاحب سے سب سے بڑا گلہ یہ تھا کہ انہوں نے پہلا مارشل لاء لگا کر قوم اور جمہوریت پر بہت بڑا ظلم کیا۔ ان کے نزدیک یہ اقدام ایوب خان کا ناقابلِ معافی گناہ ہے۔

ب) ایئر مارشل اصغر خان:۔ ایئر مارشل اصغر خان صاحب کو بھٹو صاحب ناپسند کرتے تھے۔ چند موقعوں پر جب کبھی ایئر مارشل اصغر خان صاحب کا کسی نہ کسی پیرائے میں ذکر ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ بھٹو صاحب ان سے نفرت کرتے ہیں۔ انہوں نے اصغر خان صاحب کے متعلق ایک دو مرتبہ کہا کہ وہ ایک عام سے سیدھے سادے انسان ہیں اور سیاست کی ان کو الف' ب تک کا علم نہیں۔ وہ سخت بے لچک (Rigid) انسان ہیں اور کبھی بھی سیاست میں کامیاب نہیں ہوں گے۔

مجھے ان دو لیڈروں کے درمیان اصلی اختلاف کی کوئی خاص وجہ معلوم نہیں تھی۔ جب میں بھٹو صاحب کے ساتھ تھا اس وقت تک میں جناب اصغر خان صاحب سے کبھی نہ ملا تھا۔ بہرحال ان کی لگن ' سچائی اور ایمانداری کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا۔ بدقسمتی سے ان کی پارٹی ' تحریک استقلال نے بھی جب سے وجود میں آئی ہے کوئی کارنامہ نہیں دکھایا اور اصغر خان صاحب کے سیاسی ساتھی بھی ان کو عموماً چھوڑ جاتے رہے ہیں۔ شاید بھٹو صاحب کے کہنے کے مطابق اصغر خان صاحب کی سخت گیری بہت حد تک درست ہو کیونکہ آج کل بدقسمتی سے ہمارے سیاستدانوں نے سیاست کو ایک تجارت سمجھ رکھا ہے۔ جھوٹ ' دغابازی ' بے ایمانی اور ریاکاری وغیرہ ہماری سیاست کے ستون بن چکے ہیں۔ ہمارے سیاست دان ' ماسوا چند ایک کے ' جب الیکشن لڑتے ہیں تو ان کا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ جیتی ہوئی پارٹی میں ہوں یا چند مراعات کے بدلے اس میں شامل ہو جائیں تا کہ انتخابات میں خرچ کی ہوئی رقم کو جس طرح بن پڑے کم از کم ستر بار اور موسم بہت اچھا ہو جائے تو سات سو بار زیادہ کر سکیں۔ صاف ظاہر ہے اس طرح تو ملک اور قوم کو لوٹنا ہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کھیل میں اصغر خان صاحب جیسا محبِ وطن اور ایماندار شخص ایک ناکام سیاستدان ہی رہے گا اور فصلی بٹیرے تو کبھی بھی ان کے اردگرد جمع نہیں ہوں گے۔ انہیں کسی اور ملک اور معاشرے میں ہونا چاہئے تھا۔ یہ میرا ذاتی تجزیہ ہے۔ ممکن ہے بھٹو صاحب کی ناپسندیدگی کی وجوہات کچھ اور ہوں۔

ج) ایئر مارشل نور خان:۔ ایک ملاقات کے دوران محمد حیات ٹمن جو بھٹو صاحب کے پولیٹیکل ایڈوائزر رہے تھے کے متعلق بات چیت چھڑ گئی۔ شاید اس دن کے اخبار میں حیات ٹمن صاحب کا تذکرہ ہوا تھا۔ بھٹو صاحب نے کہا ملک محمد حیات ٹمن ایک اپنی قسم کا شخص ہے لیکن ابھی تک اس نے مارشل لاء اتھارٹی کے سامنے اپنے آپ کو ایک حد تک قابلِ اعتماد شخص ثابت کیا ہے۔ اسی نشست کے دوران بھٹو صاحب نے ایئر مارشل نور خان صاحب کا بھی ذکر کیا۔ انہوں نے کہا نور خان بہت ہوشیار ' روشن دماغ اور تیز فہم انسان ہیں۔ ایئر فورس نے ایک اچھا ایڈمنسٹریٹر اور قابل افسر پیدا کیا ہے لیکن وہ ایک اولوالعزم ' شہرت اور عزت کا خواہش مند انسان ہے۔ میں نے ان سے ذکر کیا کہ میں ایئر مارشل نور خان صاحب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ جب وہ پاکستان ایئر فورس کے کمانڈر انچیف تھے تو میں پشاور میں پیراشوٹ سکول کی کمان کر رہا تھا۔ وہ پیراشوٹ جمپ کے لئے کچھ دن میرے سکول میں زیرِ تربیت رہے تھے۔ دراصل وہ تمام ہوابازوں کو اپنا نمونہ پیش کرنا چاہتے تھے تا کہ وہ بھی بلا خوف و خطر اور بغیر جھجک پیراشوٹ جمپ کریں اور جب کبھی انہیں جہاز کی خرابی کی حالت میں چھلانگ لگانی پڑے تو خواہ مخواہ جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں یا ٹانگ وغیرہ نہ توڑ لیں بلکہ چھتری کے ذریعے سیکھے ہوئے طریقے کے مطابق زمین پر بحفاظت اتر سکیں۔ ان کی سکھلائی اور چھتری کے ذریعے چھلانگ لگانے کے دوران میں نے ایئر مارشل نور خان صاحب کو بڑا نڈر اور بہادر انسان پایا۔ بھٹو صاحب کہنے لگے نور خان کو میری پارٹی میں شامل ہو جانا چاہئے تھا لیکن وہ نامعلوم وجوہ

کی بنا پر ایسا نہ کر سکے۔ ان جیسی متحرک شخصیت اور قابل ایڈمنسٹریٹر کی میری پارٹی کو ضرورت تھی۔

د) جنرل یحیٰی خان: جب کبھی یحیٰی خان صاحب کا نام آیا بھٹو صاحب نے انہیں اچھے الفاظ سے یاد کیا لیکن ہر دفعہ ایک خاص مسکراہٹ کے ساتھ ان کا ذکر کیا۔ ایک دفعہ فرمانے لگے کہ جنرل یحیٰی خان ایک بہت اچھے اور انٹیلیجنٹ شخص تھے وہ ایک شائستہ انسان تھے بشرطیکہ انہوں نے پی نہ رکھی ہو اور اگر شراب کے نشے میں ہوتے جو عموماً ہوا کرتے تھے تو پھر وہ انسان نہیں تھے بلکہ شیطان (Devil) تھے۔ کچھ اور باتیں بھی ہوئیں جنہیں قلمبند کرنا شائستگی کے خلاف ہے۔

ر) مولانا کوثر نیازی:۔ اسیری کے دوران بھٹو صاحب مولانا کوثر نیازی صاحب سے کوئی زیادہ خوش نہ تھے۔ چند مرتبہ ان کا ذکر ہوا تو بھٹو صاحب نے کچھ برہمی کا سا اظہار کیا۔ ایک دن کہنے لگے مولانا کوثر نیازی کو اللہ تعالیٰ نے اچھا دماغ عطا کیا ہے مگر وہ مولوی کا مولوی ہی رہا۔ بھٹو صاحب کو مولویوں سے بے حد چڑ تھی۔

بھٹو صاحب کی پھانسی کے کافی عرصہ بعد میری مولانا سے ایک دن اچانک ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے بھٹو صاحب کی ناخوشی کا ذکر کیا۔ کہنے لگے جناب میں بھٹو صاحب کا بے حد ممنون ہوں اور ان کی تہہ دل سے عزت کرتا ہوں اور ان کو اپنا قائد تصور کرتا رہوں گا۔ جب ہم نے دیکھا کہ بھٹو صاحب اور فوج کا ٹکراؤ ہو گیا اور ایسی حالت میں ان کا ہی نہیں بلکہ پارٹی اور ملک کا بھی نقصان ہو گا تو ہم نے دلی کوشش کی کہ اس ٹکراؤ سے بچا جائے۔ ہر ذی شعور شخص کو اس ٹکراؤ کے نتیجے کا علم تھا۔ میں نے چاہا کہ ہر قیمت پر بھٹو صاحب کو بچایا جائے اور جو راستہ ہمارے کچھ ساتھیوں نے اختیار کرنا چاہا ہے اس سے بچا جائے تاکہ مارشل لاء حکام اور بھٹو صاحب کے درمیان صلح جوئی کا کوئی راستہ نکالا جائے۔ ہماری کوششوں کو بدقسمتی سے غلط سمجھا گیا اور ہماری فوج کے ساتھ صلح کی کوشش کو بالکل غلط تصوّر کیا گیا اس محاذ آرائی (Confrontation) کا نتیجہ کیا نکلا؟ وہی جس کا مجھے ڈر تھا، یعنی ہم اپنے لیڈر کو کھو بیٹھے۔

انہوں نے کہا جن لوگوں کا خیال تھا کہ میں فوج کے ساتھ مل گیا ہوں۔ انہوں نے خود محسوس کیا ہو گا کہ میرا رویہ اس حکومت کے ساتھ کیسا تھا جب میں سینٹ کا ممبر تھا۔ میں نے ان کی ہر غلط پالیسی کو پوری قوم کے سامنے ہر طرح سے عیاں کیا اور ان کی کھل کر مخالفت کی۔

پارٹی کی بہتری کیلئے ہم نے چاہا کہ اس کو ملکی و قومی بنیاد پر اسی طرح رکھا جائے جیسا کہ اس کے بانی جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اسے سوچا اور بنایا تھا لیکن بدقسمتی سے جب یہ فیملی افیئر ہو گیا تو ہم نے خاموشی اور گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

ہ) مس بے نظیر بھٹو:۔ جناب بھٹو صاحب پاکستان، عام سیاسیات، ملکی و غیر ملکی حالات اور اپنے کیس وغیرہ کے متعلق تو کافی بات چیت کرتے رہتے تھے مگر انہوں نے اپنی فیملی کے متعلق بہت کم گفتگو کی۔ البتہ جب بھی مس بے نظیر کا کسی طرح ذکر ہوا تو انہوں نے ہمیشہ ان کے متعلق ایک خاص قدر شناسی کے

پیرائے میں بات چیت کی۔ وہ عموماً کہا کرتے تھے! کرنل رفیع، میں رہوں یا نہ رہوں، لیکن مجھے یقین ہے کہ میری بیٹی میرے مشن کو ہر حال میں پورا کرے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے بے حد صفات سے نوازا ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہی نہیں بلکہ بے حد تیز فہم، روشن دماغ اور ذی عقل بھی ہے۔ وہ جب کہا کرتے تھے کہ بے نظیر سیاست کو سمجھنے کی مجھ سے زیادہ صلاحیت و قابلیت رکھتی ہے تو میرے دماغ میں یہ سوال اٹھتا تھا کہ وہ تو ابھی تک طالب علمی کے زمانہ میں ہے۔ اسے ابھی تک سیاست سے کوئی واسطہ نہیں پڑا اور نہ ہی عملی زندگی کا کوئی تجربہ ہے تو بھٹو صاحب کی یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہوا کرتی تھی۔ بہر حال میں ہمیشہ ایک باپ کے خیالات اس کی ہونہار بیٹی کے متعلق کچھ شکوک کے ساتھ سنتا رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے، میں رہوں یا نہ رہوں، میری بیٹی پاکستان کے غریب عوام (Down Trodden Lot) کو ان کی منزلِ مقصود تک کامیابی کے ساتھ لے جائے گی۔ وہ مس بے نظیر کے دل اور دماغ کی صلاحیتوں (Head and Heat Qualities) کی بے حد تعریف کیا کرتے تھے۔ بلکہ ایک مرتبہ تو انہوں نے کہا کہ بے نظیر ہندو پاک کی تاریخ میں بے نظیر ہی بن جائے گی۔

مجھے بے نظیر صاحبہ کے ساتھ جیل میں کبھی بات چیت کرنے کا موقع نہیں ملا، البتہ وہ جب کبھی بھٹو صاحب سے ملنے آئیں تو میں عموماً وہاں ہوا کرتا تھا لیکن ایک طرف رہ کر انہیں غور سے دیکھتا اور سنتا رہتا تھا مگر ان سے کبھی کسی موضوع پر گفتگو نہیں ہوئی۔ مجھے یاد نہیں کہ بھٹو صاحب نے اپنے بیٹوں کے متعلق کبھی کبھار کچھ کہا ہو۔ کچھ موقعوں پر ان کی بیگم صاحبہ کا ذکر چھڑا جو میں نے اس کتاب میں موزوں جگہ لکھا ہے۔ بھٹو صاحب نے اپنی دوسری بیٹی، صنم بھٹو کے متعلق بھی کبھی کچھ نہ کہا۔ البتہ وہ ان سے بے حد محبت کرتے تھے کیونکہ آخری شب انہوں نے اپنی اولاد میں سے صرف صنم کا نام بار بار لیا۔ گویا آخری وقت انہیں سب سے چھوٹی بیٹی بہت یاد آئی۔

و) شاہ رضا شاہ پہلوی:۔ جب شاہ رضا شاہ پہلوی کے خلاف ایران میں بہت بڑے پیمانے پر عوامی مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک دن بھٹو صاحب نے فرمایا کہ میں نے شاہ کو بتایا تھا کہ آپ کب تک ڈھکنا بند کر کے رکھیں گے، لیکن میری یہ بات شاہ کو پسند نہ آئی تھی۔ رضا شاہ ایرانی قوم کے ساتھ مخلص نہ تھے اور انہیں امریکی نصیحتیں زیادہ ہوش مندی سے کسی حد تک قبول کر لینی چاہئیں تھیں۔ بدقسمتی سے آج کل ہر ایسا سربراہ صرف اور صرف امریکیوں پر ہی بھروسہ کرتا ہے اور آخر کار انہی سے ہر ایک کو ٹھوکر کھانا پڑتی ہے۔ جو بھی حاکم یا لیڈر اپنی قوم کے جذبات و احساسات کا خیال نہیں رکھتا اسے قوم ہمیشہ ٹھوکر مار کر دور پھینک دیتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ شاہ کیلئے شاید برا وقت آ رہا ہے اور ایرانی قوم بھی مشکلات سے دوچار ہوگی۔

ز) جنرل محمد اقبال سے شکوہ:۔ جنرل محمد اقبال صاحب انہی دنوں ڈپٹی چیف آف آرمی اسٹاف مقرر ہوئے تھے۔ ایک دن بھٹو صاحب نے باتوں باتوں میں فرمایا کہ ان کی بیگم 'نصرت بھٹو صاحبہ' لاہور قذافی

سٹیڈیم میں کرکٹ میچ کے دوران پولیس کے ہاتھوں زخمی ہو گئی تھیں اور ہسپتال میں چند دن زیرِ علاج رہی تھیں ، جنرل اقبال کو ، جو وہاں کور کمانڈر تھے ہسپتال جاکر کم از کم ان کی مزاج پرسی کر لینی چاہئے تھی۔ یہ ان کا ایک اچھا (Gesture) ہوتا۔

میں جنرل محمد اقبال کے ماتحت ملٹری انٹیلی جنس ڈائریکٹریٹ میں سروس کر چکا تھا اور ان کے ساتھ اچھے مراسم تھے۔ جنرل صاحب جونہی لاہور سے پنڈی تشریف لائے ، میں نے ان سے ملاقات کی اور جب میں ان کے ہاں سے واپس آنے لگا تو انہوں نے کہا تھا کہ گاہے بگاہے ان سے ضرور ملتا رہوں۔ بھٹو صاحب کے اس شکوے کے بعد میں جنرل صاحب سے ملنے کبھی نہ گیا کیونکہ ان دنوں میری خفیہ نگرانی ہو رہی تھی اور میں نے جان بوجھ کر کسی سینئر افسر کے ساتھ ملنا بند کر دیا تھا۔ اس لئے میں بھٹو صاحب کے اس گلے کا ذکر جنرل صاحب سے کبھی نہ کر سکا۔

ح) مسٹر کھر:۔ مجھے بھٹو۔ کھر کے درمیان گرم و سرد تعلقات کو جاننے کا تجسّس تھا۔ میں نے دو تین مرتبہ بھٹو صاحب سے موزوں موقعوں پر پوچھا کہ ان کے اور کھر صاحب کے تعلقات میں اونچ نیچ کی کیا وجہ تھی؟ وہ ہر دفعہ بغیر کچھ بتائے صرف مسکرا دیا کرتے تھے۔ آخر ایک دن کہنے لگے کرنل یہ پالیٹکس کا معاملہ ہے۔ اور پھر میری ٹانگ کھینچتے ہوئے بولے ' یہ ایک سپاہی کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ اس کے بعد میں نے کبھی دوبارہ ان سے اس معاملے پر بات چیت کرنے کی جرأت نہ کی۔

ط) مسٹر انور السادات:۔ ایک دن شاید اخبارات میں مصر یا اسرائیل کے متعلق کسی خبر کو پڑھ کر کہنے لگے کہ صدرِ مصر مسٹر سادات ' نے عرب مفادات کو امریکیوں کے دباؤ میں آکر بہت نقصان پہنچایا ہے۔ کہنے لگے انور السادات کو ایک نہ ایک دن اپنی قوم کو جواب دینا پڑے گا۔ انہیں اصولوں کو اس طرح بالائے طاق نہیں رکھنا چاہئے تھا۔ بھٹو صاحب نے کیمپ ڈیوڈ معاہدے اور مصر۔ اسرائیل تعلقات کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ کہنے لگے جو لیڈر بھی قومی امنگوں کی پروا نہیں کرتا ، قوم بھی اس کی پروا نہیں کرتی۔ مسٹر سادات کو ایک نہ ایک دن اس کا خمیازہ بھگتنا ہو گا۔ چند سال بعد انور السادات کو جب ایک قومی دن کی تقریبات کے دوران چند فوجیوں نے گولیوں سے چھلنی کر کے قتل کر دیا تو مجھے بھٹو صاحب کی باتیں یاد آئیں۔

ی) جنرل ضیاء الحق:۔ ہمارے درمیان جنرل ضیاء الحق صاحب کے متعلق بہت کم گفتگو ہوئی۔ ایک دن کہنے لگے ، جنرل ضیاء کو سیاسی لوگوں سے بے انتہا مصیبتیں دیکھنی پڑیں گی۔ ان کیلئے یہ حکومت پھولوں کی سیج ثابت نہ ہو گی۔

دو یا تین مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ میں بعد دوپہر بھٹو صاحب کے ساتھ سیکورٹی وارڈ کے صحن میں بیٹھا ہوا تھا کہ جنرل ضیاء الحق صاحب کی سواری جیل کی دیوار سے متصل سڑک پر سے گزری۔ ان کی سواری کے

آگے آگے ہوٹر والی گاڑی ہوتی تھی جو ہوٹر بجا کر ہر ایک کو خبردار کرتی جاتی تھی کہ صدرِ پاکستان کی سواری گزر رہی ہے۔ اس گاڑی کے ہوٹر کی آواز سن کر ہر دفعہ میں نے بھٹو صاحب کے چہرے پر ایک خاص غصے کی علامت دیکھی اور ان کا موڈ کافی دیر تک کچھ ناساز سا رہتا۔

ک) پاک فوج کا سب سے بڑا جنرل ۔ ایک دن پاک بھارت جنگ 1965ء کا ذکر چھڑا میں نے بھٹو صاحب سے پوچھا کہ جناب آپ اس زمانے میں وزیرِ خارجہ تھے۔ ہمارے فارن آفس نے اس جنگ سے پہلے یہ کیوں نہ سوچا کہ ہندوستان ہماری سرحدوں پر حملہ کر دے گا۔ کہنے لگے کہ دفترِ خارجہ نے تو اس کا اندازہ لگا لیا تھا لیکن فیلڈ مارشل ایوب خان نے ایک جائنٹ میٹنگ میں اس امکان کو رد کر دیا تھا۔ اسی دوران وہ کہنے لگے کہ جنرل ہیڈ کوارٹر نے بھی تو اسی غلطی کا اعادہ کیا تھا۔ پھر کہنے لگے کہ جنرل اختر ملک کو کشمیر کے چھمب جوڑیاں محاذ پر نہ روک دیا جاتا تو وہ کشمیر میں ہندوستانی افواج کو تہس نہس کر دیتے مگر ایوب خان تو اپنے چہیتے جنرل یحییٰ خان کو ہیرو بنانا چاہتے تھے۔ 1965ء کی جنگ کے اس تذکرے کے دوران بھٹو صاحب نے جنرل اختر ملک کی بے حد تعریف کی۔ کہنے لگے اختر ملک ایک باکمال جنرل تھا۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کا سالار تھا۔ وہ بڑا بہادر اور دل گردے کا مالک تھا اور فنِ سپاہ گری کو خوب سمجھتا تھا۔ اس جیسا جنرل پاکستانی فوج نے ابھی تک پیدا نہیں کیا۔ پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگے 'باقی سب تو جنرل رانی ہیں۔

پاکستان میں اسلامی حکومت۔ جنرل ضیاء الحق صاحب یوں تو شروع سے ہی کچھ نہ کچھ اس موضوع پر کہتے رہے لیکن انہوں نے غالباً 1978ء کے آخیر میں سرکاری اعلان کیا کہ پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کیا جائے گا۔ اس اعلان کے دوسرے یا تیسرے روز جب میں بھٹو صاحب سے سیکورٹی وارڈ میں ملا تو کہنے لگے کرنل رفیع تمہارا جنرل کونسا اسلام اس ملک میں رائج کرے گا۔ یہ اسلام کارخانے داروں کا ہوگا یا مولویوں کا یا عوام کے کسی حصے کا۔ کیونکہ مولوں کسی اور چیز پر تو متفق ہو سکتے ہیں لیکن اسلام پر کبھی بھی ایک رائے قائم نہیں کر سکتے۔ پھر کہنے لگے یہ ایک بڑا دھوکہ ہے جو ہمارے سادہ لوح عوام کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ جنرل ضیاء کبھی بھی اس اعلان پر عمل نہیں کرے گا۔

آج کئی سال گزر جانے کے بعد جب کہ جنرل ضیاء صاحب کو بھی ہمارے دوستوں نے اپنا مطلب نکل جانے کے بعد شہید کر دیا تو مجھے بھٹو صاحب کا یہ کہنا بالکل درست معلوم ہوتا ہے میں نے کچھ محترم اور ذمہ دار پاکستانیوں کو بھی یہ کہتے سنا ہے کہ ضیاء صاحب بھی نفاذِ اسلام میں صرف زبان کی حد تک سچے تھے۔ بدقسمتی سے انہوں نے اسلام کے نام پر اپنی حکومت کو زندگی کے آخری لمحات تک طول دیا لیکن اسلامی نظام کیلئے وہ کچھ نہیں کیا جو وہ کر سکتے تھے۔ ان حضرات کا کہنا تھا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ نظامِ اسلام کے نفاذ میں مشکلات حائل تھیں لیکن بدقسمتی سے انہوں نے بھی اس عظیم کام کو فقط سیاسی نعرہ بنا کر باقی سیاست دانوں کی طرح قوم کو بے وقوف ہی بنایا۔

میرا سر پاکستان کی قسمت ہے:

بھٹو صاحب اکثر کہا کرتے تھے کرنل رفیع اگر میرا سر گیا تو پاکستان بھی ختم ہو جائے گا۔ میں اس فقرے کا مطلب کبھی نہ سمجھ سکا اور ہر بار سوچتا تھا کہ بھٹو صاحب (My head Goes, Pakistan Goes) کہہ کر کیا بتا رہے ہیں۔ یہ فقرہ کم از کم درجنوں بار انہوں نے مختلف موقعوں پر مجھ سے کہا ہو گا۔

مجھے معلوم ہوا کہ مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ نے بھی جب مارچ 1979ء میں جنرل ضیاء الحق صاحب کے ساتھ ملاقات کی تھی تو انہوں نے بھی اس قسم کے خیالات ظاہر کیئے تھے مگر ضیاء الحق صاحب نے اس خیال کو بھٹو صاحب کا وہم سمجھ کر خارج از امکان قرار دیدیا تھا۔

پاکستان میں آبادی کا مسئلہ:۔ ایک دفعہ ہماری گفتگو کے دوران پاکستان میں بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ بھی آیا۔ شاید اس موضوع پر اس دن کے اخبار میں ذکر ہوا تھا۔ میں نے جرأت کر کے اس موضوع پر کچھ کہا کہ میرے خیال میں پاکستان کا یہ گمبھیر مسئلہ ہے۔ ہماری آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے اور آبادی میں یہ روز افزوں اضافہ ہمارے وسائل کو ختم کر رہا ہے اور ہم مادی ترقی میں وہیں کے وہیں کھڑے ہیں۔ عوام کے تقریباً تمام مصائب کی ایک بڑی وجہ ہماری آبادی میں اضافہ ہے۔ بھٹو صاحب کہنے لگے 'بھئی ان ان پڑھ مولویوں کو کون سمجھائے۔ ایوب خان نے اس مسئلے کو کنٹرول کرنے کیلئے کچھ کرنا چاہا تو ان نا سمجھ لوگوں نے اسے کیا کچھ کہنا شروع کر دیا تھا۔ پھر وہ ہنس پڑے اور کہنے لگے 'ہماری فوج ہماری آبادی کو کم کرنے کا فریضہ اسی طرح سرانجام دیتی رہی تو یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔

احمدیہ مسئلہ:۔ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس پر بھٹو صاحب نے کئی بار کچھ نہ کچھ کہا۔ ایک دفعہ کہنے لگے 'رفیع یہ لوگ چاہتے تھے کہ ہم ان کو پاکستان میں وہ مرتبہ دیں جو یہودیوں کو امریکہ میں حاصل ہے۔ یعنی ہماری ہر پالیسی ان کی مرضی کے مطابق چلے۔

ایک بار انہوں نے کہا کہ قومی اسمبلی نے ان کو غیر مسلم قرار دیا ہے اس میں میرا کیا قصور ہے۔

ایک دن اچانک مجھ سے پوچھا کہ کرنل رفیع کیا احمدی آج کل یہ کہہ رہے ہیں کہ میری موجودہ مصیبتیں ان کے خلیفہ کی بد دعا کا نتیجہ ہیں کہ میں کال کوٹھڑی میں پڑا ہوا ہوں۔ ایک مرتبہ کہنے لگے کہ بھئی اگر ان کے اعتقاد کو دیکھا جائے تو وہ تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری پیغمبر ہی نہیں مانتے اور اگر وہ مجھے ہی اپنے آپ کو غیر مسلم قرار دینے کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں تو کوئی بات نہیں۔ پھر کہنے لگے میں تو بڑا گناہ گار ہوں اور کیا معلوم کہ میرا یہ عمل ہی میرے گناہوں کی تلافی کر جائے اور اللہ میرے تمام گناہ اس نیک عمل کی بدولت معاف کر دے۔

بھٹو صاحب کی باتوں سے میں یہ اندازہ لگایا کرتا تھا کہ شاید ان کو گناہ وغیرہ کا کوئی خاص احساس نہ تھا لیکن اس دن مجھے محسوس ہوا کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔

میں خود فوج کو کیسے برباد کر سکتا ہوں:۔ بھٹو صاحب نے کئی مرتبہ مجھ سے کہا کہ میں خود جس فوج کا معمار ہوں اسے کیسے برباد کر سکتا ہوں۔ ان دنوں شاید فوج میں یہ پروپیگنڈا ہو رہا تھا کہ مسٹر بھٹو اور ان کی پارٹی فوج کو برباد کرنا چاہتی ہے۔ انہوں نے کہا میں نے تو ملک، قوم اور فوج شکستہ حالت میں حاصل کی۔ ایسٹ پاکستان کے الگ ہو جانے کے بعد ملک ٹوٹا ہوا پایا۔ قوم اور فوج شکست خوردہ حالت میں پائی۔ میں نے اپنے دن رات لگا کر اس قوم کو زندہ کیا۔ فوج جو بے جان ہو چکی تھی اس میں جان ڈالی۔ اس کو بہترین ہتھیار مہیا کئے، اس کا مورال اونچا کیا اس میں دوبارہ زندگی کی لہر پھونکی، اب آپ کے جرنیل کہہ رہے ہیں کہ بھٹو فوج کو برباد کرنا چاہتا تھا۔ میں اس ملک اور فوج کو بنانے والا ہوں۔ میں اسے برباد کرنے کی بات کیسے سوچ سکتا ہوں؟

ایک دن کہنے لگے مجھے پارٹی کے کئی لوگوں نے مشورہ دیا کہ دنیا کی بیشتر افواج میں بیٹ مین (Bat, Man) کی سہولت ختم کردی گئی ہے لیکن ہمارے ہاں یہ نو آبادیاتی (Colonial) رسم جاری ہے۔ ہماری فوج میں افسران کے علاوہ جے سی اوز (JCOS) کو بھی یہ سہولت حاصل ہے۔ اس طرح ہمارے بے شمار سپاہی فوجی کام نہیں کر رہے بلکہ ایک نوکر کا کام کر رہے ہیں۔ یہ عمل ایک سپاہی کی خودداری کی نفی کرتا ہے۔ ہماری فوج اس سسٹم کی وجہ سے تقریباً دو ڈویژن نفری سے محروم ہو رہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ لال فیتے والے افسران تو ڈرائیور، باورچی، خانساماں اور بیٹ مین تک الگ الگ رکھے ہوئے ہیں۔ بلکہ سینئر ریٹائرڈ آفیسر اپنے مرنے تک کئی کئی سپاہی اپنے گھروں اور زمینوں پر رکھے ہوئے ہیں جبکہ وہ تنخواہ اور راشن فوج سے لے رہے ہیں۔ کہنے لگے کئی احباب نے کہا کہ اس قسم کی لعنت کو فوج سے ختم کیا جائے لیکن میں نے کہا کہ بھٹو کے دور میں نہیں، بعد میں خود بخود یہ لعنت فوج سے نکل جائے گی۔ کہنے لگے رفیع صاحب میں تو ہر لحاظ سے فوج کی بہبودی کیلئے ہر کام کرنے کیلئے ہمیشہ تیار رہا ہوں تاکہ ہمارا ہر فوجی دل لگا کر اپنی سروس کرے۔ پھر کہنے لگے بھٹو فوج کو ختم کرنے کی کس طرح سوچ سکتا ہے؟

مشرقی پاکستان کا سانحہ:۔ میں نے خود بھٹو صاحب سے مشرقی پاکستان کے سانحے پر کبھی گفتگو نہیں کی تھی بلکہ جب کبھی پریس میں اس سانحہ پر کوئی خبر یا کالم چھپا، ان پر یا ان کی پارٹی پر نکتہ چینی کی گئی یا ان کو ہدف بنایا گیا تو وہ عموماً اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے کہ ان کا مشرقی پاکستان کے سانحہ کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ ایک دفعہ کہنے لگے کہ اگر آپ لوگوں کے حق کو دبائیں گے تو وہ ایک نہ ایک دن آپ کے خلاف ضرور اٹھ کھڑے ہوں گے۔ مارشل لاء کا بار بار لگنا اور فوج میں بنگالیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر دیکھ کر ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ حکومت میں انہیں ان کا حصہ کبھی نہ مل سکے گا۔ پھر فوج کا استعمال بھی غلط طریقے سے ہوا اور آخیر میں ہندوستان نے موقع پا کر ہمیں دولخت کرنے پر بڑا کردار ادا کیا۔ جب بھی اس موضوع پر بات ہوئی انہوں نے ہمیشہ زور دے کر کہا کہ ان کا اس

میں ذرہ بھر بھی قصور نہیں۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھے بتایا کہ روس کی حکومت نے اپنے سفیر کو ان کے پاس بھیجا اور مسٹر مجیب الرحمٰن کو قید سے رہا کرنے کی درخواست کی تھی' کہنے لگے کہ ایک پڑوسی سپر پاور کی درخواست رد کرنا کوئی عقل مندی نہ تھی اسلئے میں نے مسٹر مجیب کو رہا کرنے کا حکم دیدیا۔

ناشکری قوم:۔ سپریم کورٹ سے ان کی اپیل نامنظور ہونے کے بعد ایک دن انہوں نے کہا کہ پاکستانی قوم بہت ناشکری قوم ہے۔ میں نے اس قوم کیلئے کیا کچھ نہیں کیا بلکہ اس قوم کی شہرت اور طاقت جس کیلئے میں ہمیشہ کوشاں رہا اس کی سزا مجھے جیل میں بند کر کے دی جارہی ہے اور میری قوم کو کچھ پروا نہیں ہے۔ کہنے لگے کاش میں ترکی یا جرمنی میں پیدا ہوا ہوتا۔ یہ دو ایسی قومیں ہیں جو میری قدر کرتیں اور مجھے پوری عزت دیتیں۔ ایک اور موقع پر بھٹو صاحب نے کہا کہ جرمن دنیا کی بہترین قوم ہے۔ دنیاوی طاقتوں نے ان کے حصے بخرے کر رکھے ہیں لیکن وہ دن دور نہیں جب یہ قوم پھر ابھرے گی اور ساری دنیا اس کی قیادت پر فخر محسوس کریگی۔ انہوں نے ترکوں کی بہادری اور قومیت پر بھی ایک دن اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

نواب محمد احمد خان قصوری کے قتل کا کیس:۔ بھٹو صاحب نے کئی مرتبہ مجھ سے کہا کہ کرنل رفیع خدا شاہد ہے کہ میرا اس کیس سے کسی طرح کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ یہ بالکل جھوٹا مقدمہ ہے اور مجھے اس میں خواہ مخواہ پھنسانے کی ــــــ کوشش کی گئی ہے۔ یہ بات انہوں نے مجھ سے کئی بار کہی ہوگی۔

بڑے سلوک پر بھٹو صاحب کی شکایات:۔ بھٹو صاحب ہمیشہ شکایت کیا کرتے تھے کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جارہا۔ انہوں نے چند مرتبہ مجھ سے کہا کہ جب وہ ملک کے سربراہ تھے اور ولی خان' مینگل' مری اور بزنجو صاحب کو قید کیا گیا تھا تو انہوں نے ریسٹ ہاؤسز کو لاکھوں روپے خرچ کر کے فرنش کروایا تھا تاکہ یہ لیڈر آرام سے اپنے دن گزاریں۔ جب جنرل ٹکا خان صاحب اور پیرزادہ صاحب کو پکڑ کر مارشل لاء حکام نے جنرل صاحب کو مری ریسٹ ہاؤس اور پیرزادہ صاحب کو ان کے کراچی والے گھر میں رکھا تو بھٹو صاحب سخت برانگیختہ ہوئے اور کہنے لگے کہ چونکہ وہ تمہارا فوجی جرنیل ہے جو ریسٹ ہاؤس میں مزے کر رہا ہے تو کیا میں اس ملک کا سربراہ نہیں تھا کہ مجھے جیل میں ٹھونسا ہوا ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ یہ میری عزّت کا سوال ہے۔ ایک دفعہ وہ بڑے طیش میں آگئے اور کہنے لگے "کرنل میں ان سب سے بدلہ لونگا"۔ میں نے ان کو آہستہ سے یاد دلایا کہ جناب آپ اسی قسم کے جملوں کی وجہ سے تو یہ تکلیف برداشت کر رہے ہیں تو انہوں نے فوراً کہا "یہ صرف میرے اور آپ کے درمیان میں ہے"

ایک اور موقع پر وہ اسی طرح طیش میں آگئے اور کہنے لگے اگر ایک بھٹو بھی زندہ رہا تو ضرور بدلہ لے گا۔ جب میں نے پھر ان کو یاد دہانی کرائی تو کہنے لگے "کرنل رفیع یہ صرف ہم دونوں میں ہے"

Colonel Rafi, it is only between the two of us.

بہر حال جیل کی کڑی پابندیوں اور ناروا سلوک پر بھٹو صاحب کو بے حد شکایت رہی۔

بھٹو صاحب کا بے مثال حافظہ:۔ بھٹو صاحب کی یادداشت غیر معمولی تھی۔ وہ پرانی ملاقاتوں کے صحیح الفاظ، وقت، موقع و محل اور تاریخ بلکہ واقعات کی معمولی تفصیل تک یاد رکھتے تھے، اور ہر موقع کی بات چیت، حتیٰ کہ لباس اور کیا کچھ کس پیرائے میں کہا گیا تھا معمولی جزئیات تک ان کے ذہن میں محفوظ رہتی تھیں۔ میں نے کچھ کہا تو وہ مجھے کافی مدت کے بعد بھی یاد دلایا کرتے تھے کہ فلاں موقع پر میں نے یہ کہا تھا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ سے اگر میں نے کوئی بات کہی اور اسی موضوع پر بھٹو صاحب سے معمولی اختلاف کے ساتھ بات ہوئی تو انہوں نے فوراً ہماری پرانی بات کا حوالہ دیا۔ ہم لوگ فوج میں عموماً اپنی ڈائری کا استعمال کرتے ہیں تاکہ یادداشت ڈائری کی مدد سے واپس لائی جا سکے مگر بھٹو صاحب کے دماغ میں ہر بات نقش ہو جاتی تھی اور وہ معمولی سے معمولی بات کو بھی یاد رکھتے تھے۔ ایسی تیز یادداشت کا مالک کوئی اور شخص میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔

جناب پیرزادہ کی جنرل ضیاء الحق صاحب سے ملاقات:۔ عبدالحفیظ پیرزادہ صاحب بھی بھٹو صاحب کے وکلاء میں سے ایک تھے۔ وہ بھٹو صاحب کی پنڈی جیل میں اسیری کے شروع کے دنوں میں تو کبھی نہ آئے تھے لیکن سپریم کورٹ سے اپیل کے نامنظور ہو جانے کے بعد وہ کئی مرتبہ جیل میں بھٹو صاحب سے ملے۔ پیرزادہ صاحب 14 فروری سے 31 مارچ 1979ء تک 18 مرتبہ بھٹو صاحب سے ملنے جیل میں آئے۔ اسی دوران شاید مارچ 1979ء میں وہ جنرل ضیاء الحق صاحب سے بھی ملے اور بھٹو صاحب کے کیس پر ان سے تفصیلاً بات چیت کی۔ مجھے کہیں سے اڑتی سی خبر ملی کہ پیرزادہ صاحب نے جنرل ضیاء الحق صاحب سے بھٹو صاحب کو معافی کی درخواست کی اور ان سے کہا کہ اگر بھٹو صاحب کی جان بخشی نہ کی گئی تو ملک ایک بڑے بحران سے دوچار ہو گا اور شاید اس بحران کی وجہ سے ملک مشرقی پاکستان کی طرح پھر ٹوٹ جائے لیکن جنرل ضیاء الحق صاحب نے ان کی اس دلیل سے اتفاق نہ کیا۔

اس خبر کے سننے کے بعد میں نے بھٹو صاحب سے اس کا ذکر کیا جس پر انہوں نے فرمایا کہ ہاں پیرزادہ نے یہ دلائل میری مرضی کے بغیر ہی جنرل ضیاء کو دیئے ہیں۔ یہ سب کچھ ان کا اپنا ہی خیال تھا جسے جنرل ضیاء نے ماننے سے انکار کر دیا۔

بھٹو صاحب کا ہاتھ اور انکی زندگی کی لکیر۔ میں پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں زیر تربیت تھا جب مجھے ایک ساتھی کیڈٹ کے ذریعے دست شناسی کا شوق پیدا ہوا۔ کمیشن حاصل کرنے کے بعد میں نے اس مشغلے کو کافی سنجیدگی سے لیا۔ بہت سی کتابیں پڑھیں، بے شمار ہاتھ بھی دیکھے۔ اب بھی جب کبھی گاؤں جاتا ہوں تو بزرگ خواتین اپنے اہل و عیال کے ساتھ گھیر لیتی ہیں۔ لیکن جب انہیں بتاتا ہوں کہ مجھ سے یہ علم لے لیا گیا ہے تو وہ بہت رنجیدہ ہو جاتی ہیں۔ مگر پھر بھی اصرار کرتی ہیں کہ میرے اس بچے کی قسمت کے متعلق کچھ تو بتاؤ۔

کافی عرصہ ہوا میں نے پامسٹری کو پڑھنا اور پریکٹس کرنا چھوڑ دیا ہے لیکن اس کے باوجود میں کسی

بھی ہاتھ کو دیکھتے ہی چند بڑی لکیروں پر نظر دوڑا لیتا ہوں۔

جس دن سے بھٹو صاحب کے ساتھ جیل میں ملنا ملانا شروع ہوا اور ان کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ کا سلسلہ چل نکلا تو میرا دست شناسی کا پرانا اشتیاق جاگ اٹھا۔ دراصل بھٹو صاحب خوب باتیں کیا کرتے تھے اس دوران انکی زبان کے ساتھ ساتھ ان کے ہاتھ بھی ہوا میں لہراتے رہتے تھے۔ میری آنکھیں ان کے ہاتھ پر جمی رہتی تھیں۔ ان کے ہاتھ کی لکیروں کو بار بار دیکھتا رہتا تھا۔ ان کی شمسی اور قسمت کی لکیریں بے حد نمایاں تھیں۔ دل' دماغ اور زندگی کی لکیریں بھی کافی غور سے دیکھیں۔ اس کیس کی وجہ سے میں ان کی زندگی کی لکیر کو بار بار دیکھتا ان کی یہ لکیر سوائے پہلے چند سالوں کے جو عموماً ہر ہاتھ پر ایسی ہی ہوتی ہے' باقی گہری' صاف' بغیر کسی خلل اندازی یا کٹ کے شروع سے کلائی تک بالکل نمایاں تھی' یعنی زندگی کی لائن ٹوٹ پھوٹ' جزیرے یا کٹ وغیرہ سے مبرا تھی۔ یہی نہیں بلکہ مددگار لکیر بھی موجود تھی۔ مجھے ان کے ہاتھ پر کسی حادثے یا اچانک موت کی کوئی نشانی نہیں ملی۔ اس لئے مجھے یقین ہو رہا تھا کہ ان کو سزا تو ہو سکتی ہے لیکن پھانسی سے ان کی زندگی ختم نہیں ہوگی۔

ان کی اپیل خارج ہونے کے بعد جب ایک روز وہ باتیں کر رہے تھے اور ہاتھ کو میرے سامنے خوب ہلا رہے تھے' میں ان کی زندگی کی لکیر کو خوب غور سے دیکھ رہا تھا تو کہنے لگے رفیع میرے ہاتھ پر کیا ہے جسے آپ اتنے غور سے دیکھ رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا جناب آپ کے ہاتھ پر زندگی کی لکیر سے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی زندگی کافی دراز ہے۔ جواب میں انہوں نے کہا کرنل' بھٹوز ہمیشہ جوانی میں ہی مرتے رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا لیکن آپ کا ہاتھ تو اس کے خلاف کہہ رہا ہے۔ وہ مسکرائے' اپنے ہاتھ کو دیکھا اور مجھ سے کہا' کیا آپ پامسٹری جانتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ گذشتہ سالوں میں یہ میرا مشغلہ رہا تھا لیکن آج کل اسے چھوڑا ہوا ہے۔ انہوں نے پھر اپنے ہاتھ کو دیکھا اور میرا خیال تھا کہ وہ اپنا ہاتھ مجھے تھما دیں گے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ پھر کہنے لگے کرنل رفیع آپ نے چودھری یار محمد سے ایک دفعہ کہا تھا کہ دو گردنوں میں سے ایک کو جانا ہے' بھٹو کی گردن یا جنرل ضیاء کی گردن۔ چونکہ بھٹو کی گردن اندر ہے اسلئے شاید اسے ہی جانا ہوگا۔ میں نے جواب دیا کہ میں اس سے انکار نہیں کرتا لیکن وہ ایک عام سی خیال آرائی تھی مگر آپ کے ہاتھ کی لکیر تو ایسا نہیں کہتی۔ بھٹو صاحب نے اس موضوع پر اور کچھ نہ کہا بلکہ خود بخود ہی کچھ دیر میں کوئی اور بات چھیڑ دی۔

پامسٹری کی پریکٹس یعنی ہاتھ دیکھنے تو میں نے ساٹھ کی دہائی کے آخیر سے چھوڑ دیئے تھے لیکن ان لکیروں کے علم کا یقین رہا یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ایک علم انسان کو دیا ہے۔ بھٹو صاحب کی پھانسی کے بعد مجھے اس علم پر بہت شک و شبہ ہو گیا۔ حتیٰ کہ میں نے اپنے ہاتھ پر بھی نظر ڈالنا چھوڑ دیا۔ دل و دماغ میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ بہت عرصہ بعد ایک دن ایم اے ملک کا یہ بیان پڑھ کر دل میں کچھ ڈھارس بندھی کہ کچھ سرکردہ دست شناسوں نے کہا ہے کہ شہید کے ہاتھ پر زندگی کی لکیر ہمیشہ موجود رہتی

ہے۔ اس کے ہاتھ کی لائف لائن کبھی نہیں ٹوٹتی کیونکہ وہ مرتا نہیں ہے۔ بھٹو صاحب کی پھانسی کے بعد میرا یقین پامسٹری سے اٹھ گیا تھا لیکن اس بیان کے پڑھنے کے بعد پھر سے اس علم پر کچھ یقین سا ہونے لگا۔ کیا خبر، کب تک ہمارے عظیم لیڈروں کی قسمت میں شہادت ہی کی سعادت لکھی جاتی رہیگی.....! میں یہ الفاظ لکھ ہی رہا تھا کہ حسن اتفاق سے باہر سے کسی نے یہ نعرہ بلند کیا

"پاک امریکہ دوستی زندہ باد"!

سیاستدان، نعرہ اور جلسہ:۔ ایک شام کو میں جیل کیمپ میں جوانوں کے ساتھ والی بال کھیلنے کے بعد سیکورٹی وارڈ میں بھٹو صاحب کے ساتھ جا بیٹھا۔ ہم صحن میں چائے پی رہے تھے۔ ان دنوں 111 بریگیڈ کی یونٹوں کے درمیان باسکٹ بال کے میچ ہو رہے تھے۔ 3 ایف ایف رجمنٹ کی ٹیم اپنا میچ جیت کر گاڑیوں میں واپس پرائم منسٹر ہاؤس کے نزدیک اپنی لائنوں کو جا رہی تھی۔ خوشی میں وہ خوب نعرہ بازی کرتے جیل کے سامنے سے گزرے۔ جونہی بھٹو صاحب نے نعروں کی آواز سنی تو فوراً مجھ سے پوچھا' یہ کون لوگ نعرے لگا رہے ہیں؟ کیا جلسہ ہوا ہے؟ میں نے ان کو بتایا کہ مارشل لاء کے دنوں میں جلسے اور نعرہ بازی اور وہ بھی چھاؤنی کی حدود میں کیسے ممکن ہے۔ یہ شاید یونٹوں کے درمیان میچ ہو رہے ہیں اور جیتی ہوئی ٹیم اور ان کی پلٹن کے جوان خوشی میں نعرے لگا رہے ہیں۔ بھٹو صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے اور کافی دیر ان پر سکوت سا طاری رہا۔

افغانستان۔ 1978ء کی دوسری ششماہی میں افغانستان کے متعلق ہر روز پریس میں کچھ نہ کچھ شائع ہوتا رہتا تھا۔ بھٹو صاحب اخبارات کا کافی گہرائی سے مطالعہ کیا کرتے تھے۔ ان دنوں ان سے جب بھی ملاقات ہوتی وہ اکثر افغانستان کے متعلق کچھ نہ کچھ کہا کرتے تھے۔ جنرل ضیاء الحق صاحب کی افغان پالیسی سے بھٹو صاحب بالکل متفق نہ تھے۔ حالانکہ اس وقت امریکی امداد باقاعدگی سے شروع نہ ہوئی تھی اور پاکستان نے ابھی تک افغان مسئلے کے ساتھ اپنے آپ کو پوری طرح وابستہ نہیں کیا تھا۔ بھٹو صاحب نے ایک دو مرتبہ فرمایا کہ انہوں نے سردار محمد داؤد کے ساتھ پاک افغان تعلقات بمع ڈیورینڈ لائن اور پختونستان کے صلح خواہی میں ہی فیصلہ کر لیا تھا۔ انہوں نے کہا بدقسمتی سے اگر ان کی حکومت ختم نہ کر دی جاتی تو سردار محمد داؤد کے مارے جانے سے بہت پہلے ہی مسائل ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دوستانہ انداز میں فیصل ہو گئے ہوتے۔

بھٹو صاحب کا یہ بھی کہنا تھا کہ روس چونکہ سپر پاور ہی نہیں بلکہ ہمارا ہمسایہ بھی ہے اسلئے روسیوں کے ساتھ ہمارے تعلقات بہت اچھے ہونے چاہئیں اور پاکستان کو روس کے خلاف افغانیوں کی مدد نہیں کرنی چاہئے چونکہ اس وقت تک امریکی امداد پاکستان کے ذریعے افغانستان کے مجاہدین کو باقاعدگی کے ساتھ شروع نہیں ہوئی تھی، مجھے اپنے ملک کی پالیسی کا پورا علم نہ تھا اور میں ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ پاکستان کوئی عملی حصہ نہیں لے رہا۔ لیکن بھٹو صاحب اس بات کو نہیں مانتے تھے اور ہر دفعہ حکومت پاکستان کی افغان

پالیسی کی مذمت ہی کیا کرتے تھے۔ شاید یہ پیپلز پارٹی کی متفقہ اور فیصلہ کن پالیسی تھی یا امریکہ بادشاہ نے بعد میں محترمہ بے نظیر صاحبہ کو وزیر اعظم بننے سے پہلے ان سے یہ فیصلہ کروالیا تھا کہ پاکستان افغان پالیسی کو اب امریکیوں کی نئی مرضی کے مطابق چلائے گا کیونکہ ضیاء الحق صاحب کی شہادت کے بعد جونہی پیپلز پارٹی کی حکومت دوبارہ آئی تو افغانستان کے متعلق ہماری پالیسی میں بالکل ٹرن اباؤٹ ہو گیا اور میدان جنگ میں جیتی ہوئی لڑائی ہم کانفرنس کی میز پر ہار رہے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ افغانی اپنی اسلامی محبت کے خلاف امریکیوں اور روسیوں کے نئے گٹھ جوڑ کو ناکارہ کرنے میں کس طرح کامیاب ہوتے ہیں۔

مارشل لاء پر گفتگو۔ بھٹو صاحب نے میرے ساتھ گفتگو میں مارشل لاء یا فوج کو خاص تنقید کا نشانہ کبھی نہ بنایا تھا۔ البتہ ہماری کچھ انڈر سٹینڈنگ ہو جانے کے بعد کبھی کبھار جرنیل صاحبان پر کوئی نہ کوئی ریمارک پاس کر دیا کرتے تھے۔ ایک دن پاکستان میں مارشل لاء کے تسلسل کا ذکر چھڑا تو میں نے ان سے کہا کہ 1958ء کے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صاحب والے مارشل لاء کے دنوں میں، میں سیکنڈ لیفٹیننٹ تھا جس کی وجہ سے مجھے فوج، قوم یا ملک پر مارشل لاء کے اثرات سے متعلق کوئی خاص فکر نہ تھی۔ مارشل لاء لگنے سے پہلے ملکی حالات بد تر ہو چکے تھے اور تقریباً ہر آدمی نے مارشل لاء کے نفاذ کو خوش آمدید کہا تھا، ہم جونیئر آفیسرز بھی عوام کے ساتھ تھے اور ہم نے بھی یہی سمجھا تھا کہ یہ ملک و قوم کے لئے خوش آئند بات ہے۔ دوسرے مارشل لاء کے وقت، جو یحییٰ خان صاحب کا مارشل لاء کہلوایا اور جس کی ذمہ داری بعد میں آپ کے کندھوں پر بھی پڑی، میں میجر تھا۔ میرے اس ریمارک پر، بھٹو صاحب نے فوراً مجھے ٹوکا اور کہنے لگے وہ (بھٹو صاحب) تو عوامی لیڈر ہیں اور انہوں نے ورثے میں سب کچھ پایا لیکن ان حالات کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم کر دینا چاہا اور ملک کو پہلا عوامی آئین دیا۔ میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ جنرل ضیاء صاحب کا مارشل لاء، جو آج کل ملک کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے، میں نے کافی سروس کر لی ہوئی ہے اور ایسے فرائض پر مامور ہوں کہ مارشل لاء کے اثرات کو بہت گہرائی سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ مارشل لاء کے تسلسل سے فوج کو بے حد نقصان پہنچ رہا ہے۔ ملک و قوم کو بھی گھاٹا ہی گھاٹا ہے لیکن بدقسمتی سے ہمارے سیاستدان ہر دفعہ ملک کو ایسے دوراہے پر لا کھڑا کرتے ہیں کہ فوج کو چاروناچار ملک کو چلانے کیلئے مارشل لاء کا سہارا لینا پڑتا ہے ورنہ ملک میں خانہ جنگی جیسے حالات پیدا کر دیئے جاتے ہیں اور ملک کو تباہی سے بچانے کیلئے ایسا قدم اٹھانا پڑتا ہے۔ بھٹو صاحب میرے ساتھ متفق نہ ہوئے اور کہنے لگے، کرنل رفیع سیاسی حالات کو سیاستدان ہی سنوار سکتے ہیں اور انہی کو فیصلہ کرنے دینا چاہیے۔ ہر ملک میں سیاست دانوں کے آپس میں اختلافات اور جھگڑے ہوتے ہیں لیکن وہی آخر مل جل کر ان کا کوئی نہ کوئی حل نکالتے ہیں۔ ہمارے ملک میں جن لیڈروں کو عوام رد کر دیتے ہیں وہ حکومت کیلئے کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کرتے رہتے ہیں لیکن جمہوریت میں عوامی نمائندوں کو حق حاصل ہے کہ وہ ملک و قوم کی بہتری کیلئے اپنی پالیسیاں بنائیں اور ان کے مطابق ملک کو چلائیں۔ ہمارے ملک میں جو پارٹی یا پارٹیاں حکومت

سے باہر ہوتی ہیں وہ ہر پالیسی کو غلط ہی تصور کرتی ہیں ـــــ ـ ـ ـــــــــ اور اگر ان کا آپس میں اختلاف بڑھ جائے تو فوج کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بندر بانٹ شروع کر دے۔ جب کبھی حالات ذرا خراب ہوں کئی جرنیل ایسے موقعوں کی تلاش میں ہوتے ہیں اور وہ فوراً ملک و قوم کے نام پر فوج کے بل بوتے پر مارشل لاء لگا کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔ دراصل ہر ایسے موقع پر باہر کی طاقتوں' خاص کر ہمارے دوست امریکہ' کا ہاتھ ہوتا ہے۔ جو پہلے ملکی حالات کو خراب کرنے میں مدد دیتی ہیں اور پھر اپنی مرضی کے جرنیلوں کو مارشل لاء لگانے پر اکساتی ہیں اور ان کی مدد بھی کرتی ہیں۔ کہنے لگے بدقسمتی سے ہمارے ملک کی آزادی مارشل لاز ہی ختم کریں گے۔

مسٹر بھٹو کے اپنی پارٹی کے متعلق خیالات:۔ 1978ء کے دنوں میں بھٹو صاحب نے اپنی پارٹی کے متعلق کبھی کوئی بات نہ کہی تھی۔ وہ پارٹی کے خلاف بات سننے کو تیار نہ تھے۔ چونکہ پارٹی کی طرف سے کوئی خاص اضطراب یا بے چینی کا مظاہرہ نہ ہوا تو میں نے ایک بار پارٹی کی اس بے حسی پر تنقید کی' جس کو بھٹو صاحب نے فوراً رد کر دیا۔ میں نے اس موقع پر ایک افسر کا قصہ سنایا جو اس نے ایک کانفرنس میں بیان کیا تھا کہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ پی پی پی کے بڑے بڑے شیر آجکل چوہے بنے ہوئے ہیں۔ کیونکہ بھٹو صاحب جن دنوں اقتدار میں تھے' وہ خود چونکہ ایک بلی کی طرح تھے اور ان کے آنے پر تمام کارندے' چوہوں کی طرح اپنے اپنے بلوں میں گھس جاتے تھے' اب جبکہ انہیں باہر نکل کر بھٹو صاحب کی اسیری کے خلاف شور و غل مچانا اور قربانیاں دینا چاہئیں' تو وہ اسی طرح مارشل لاء کے ڈر سے پرانی عادت کے مطابق بلوں میں گھسے ہوئے ہیں۔ بھٹو صاحب نے فوراً کہا کہ کون ہے جو اپنی انگلیاں بھی جلانے کو تیار ہو لیکن ہمارے کارکن اپنے آپ کو آگ لگا کر جلا رہے ہیں (ان دنوں کچھ غربا نے احتجاجاً اپنے کپڑوں پر مٹی کا تیل چھڑک کر اپنے آپ کو آگ لگا کر جلانا چاہا تھا) اور کہنے لگے میں نے ان کو ایسا کرنے سے منع کیا ہے ورنہ اب تک بے شمار لوگ اپنی جانوں کا نذرانہ دے چکے ہوتے۔ اس پر میں نے ایک اور افسر کا قصہ سنایا کہ کچھ غریب لوگوں کو پیسوں کا لالچ دیکر تیار کیا گیا کہ وہ اپنے آپ کو آگ لگائیں اور فوراً ان کو کمبلوں سے لپیٹ لیا جائے گا اور جلنے نہ دیا جائے گا' مگر ایسے غریبوں کو معاوضہ بہت بڑا دیا جاتا ہے۔ بھٹو صاحب یہ سن کر بڑے طیش میں آ گئے اور کہنے لگے یہ سب بکواس اور جھوٹ ہے۔ پھر کہنے لگے' دراصل انہوں نے اپنی پارٹی کو حکم نامہ (   ) بھیجا تھا کہ ابھی وقت نہیں ہے اور کوئی اپنے آپ کو اس طرح نہ جلائے اور نہ مارے۔ مجھ سے انہوں نے کہا کہ اپنے جرنیلوں سے کہو کہ وہ مجھے (بھٹو صاحب) راولپنڈی سے صرف لاہور تک جانے دیں اور مجھے وہاں عوام کو ایڈریس کرنے دیں اور پھر دیکھیں کہ لوگ بھٹو کو کیسے چاہتے ہیں اور مارشل لاء ان کو کیسے روک سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میری پارٹی مجھ پر جان دینے کو تیار ہے اور وقت آنے پر یہ کارکن ثابت کر دکھائیں گے کہ ان کیلئے بھٹو کیا حیثیت رکھتا ہے اور وہ اس کو کس حد تک چاہتے ہیں۔ کہنے لگے میری پارٹی میں ایک معمولی سی تعداد موقع پرست لوگوں کی ہے' جو

اپنے آپ کو چھپا رہے ہیں لیکن ان سے میری پارٹی کندن بن کر نکلے گی۔

لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا بھٹو صاحب کچھ مایوس سے ہوتے گئے۔ اوائل 1979ء میں وہ اپنی پارٹی سے جو امیدیں لگائے بیٹھے تھے وہ بر نہ آ رہی تھیں۔ ایک دن کچھ مایوسی کے عالم میں مجھ سے کہنے لگے کہ وہ حرامزادے کدھر ہیں جو کہا کرتے تھے کہ ہم اپنی گردنیں کٹوا دیں گے (اپنی انگشتِ شہادت گردن کی ایک طرف سے دوسری طرف کھینچتے ہوئے) میرے خیال میں وہ دن ایسے تھے (فروری مارچ 1979ء) جب بھٹو صاحب اپنی پارٹی سے نا امید ہو رہے تھے۔ حالانکہ دوسری طرف مارشل لاء حکام بے حد فکر مند تھے جس کا میں کچھ ذکر "احتیاطوں اور مزید احتیاطوں" میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔ پھر لمحۂ فکر، عروج کو پہنچ رہا تھا کہ کہیں سپریم کورٹ میں بھٹو صاحب کی اپیل خارج ہونے پر پارٹی بڑے پیمانے پر گڑ بڑ نہ کرے اور لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ کھڑا ہو جائے۔ لیکن ہر آدمی پارٹی کی بے حسی پر حیران تھا کہ کسی نے اپنی انگلی تک نہیں اٹھائی۔ اس وقت صرف ماں اور بیٹی بے حد بے قرار اور فکر مند تھیں، باقی تمام اشخاص خصوصاً پارٹی کے بڑے چھوٹے ستون، خاموش تماشائی بنے ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی جب تین اور چار اپریل 1979ء کی رات کو بھٹو صاحب کو بتایا گیا کہ ان کو پھانسی دی جا رہی ہے اور اس کے بعد انہوں نے مجھ سے اکیلے میں پوچھا کہ یہ کیا ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ جناب آپ کو واقعی آج رات پھانسی دی جا رہی ہے تو اس رات انہوں نے کہا تھا کہ میری پارٹی مردہ بھٹو دیکھنا چاہتی تھی نہ کہ زندہ بھٹو۔ میں نے "آخری لمحات" کے عنوان سے اس کتاب کے آخر میں ان لمحات کی پوری تفصیل بیان کی ہے۔ جس وقت بھٹو صاحب کا ہر ایک لفظ اور ہر ایک لمحہ ریکارڈ کیا جا رہا تھا۔ میں آج ان منافق سرفروشوں کو بتا دوں کہ بھٹو صاحب اپنی پارٹی سے آخری لمحات میں خوش نہ تھے۔ اس میں شک نہیں کہ کارکنوں کی ایک معمولی سی تعداد جو صرف غریب اور متوسط طبقہ سے تعلق رکھتی تھی، ان دنوں جیلوں میں بند تھی لیکن اصلی فائدے اٹھانے والے اور پارٹی کے بہت سے لیڈر اس نازک وقت پر اپنے آپ کو چھپا رہے تھے۔ شاید ان میں سے بہت سے آج کل پھر لیڈر بن کر پارٹی کے اصلی غم خوار بنے ہوئے ہوں، کیونکہ ریاکاری میں تو ہم اپنی مثال آپ ہیں۔

بھٹو صاحب کا وفادار۔ جنوری 1979ء میں بھٹو صاحب نے مجھ سے ایک دن فرمائش کی کہ وہ اپنا کتا سیل میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ حکام شاید اس کو اندر لانے کی اجازت نہ دیں گے لیکن پھر بھی مجھے انکار کی جرأت نہ ہوئی۔ 20 جنوری 1979ء کے دن محترمہ بے نظیر صاحبہ نے بھٹو صاحب سے ملنے آنا تھا۔ میں نے اس دن ڈیوٹی آفیسر سے کہا کہ اگر محترمہ بے نظیر اپنے ساتھ پپ لائیں تو اس کی پروا نہ کرتے ہوئے اندر جانے دینا۔ میں خود جیل کے دفتر سے کہیں باہر چلا گیا۔ محترمہ بے نظیر کتا اپنے ساتھ سیل میں لے گئیں۔ کتے کے اندر جانے کی باقاعدہ رپورٹ نہ دی گئی لیکن حکام کو اس کے داخلے کی اطلاع دوسرے ذرائع سے مل گئی اور مجھ سے جواب طلبی بھی ہوئی۔ مجھے بتایا گیا کہ کتے کی سونگھنے

کی قوت انسان سے نوے ہزار گنا اور سننے کی قوت چار سو گنا زیادہ ہے۔ یہ جانور قیدیوں کو جیل سے باہر نکالنے کے کام میں بے حد مؤثر ثابت ہو سکتا ہے اور مجھے خبردار کیا گیا کہ آئندہ مجھ سے ایسی غلطی ہرگز سرزد نہ ہونے پائے۔ بہرحال میری اگلی ملاقات پر بھٹو صاحب نے میرا شکریہ ادا کیا۔

بھٹو اور میں۔ فروری 1979ء میں ایک دن بعد دوپہر میں، بھٹو صاحب کے ساتھ سیکورٹی وارڈ کے صحن میں بیٹھا گپ شپ کر رہا تھا انہوں نے میرے بارے میں بات چیت کو بڑھاتے ہوئے فرمایا "کرنل رفیع تم بریگیڈیئر تو ضرور ہو جاؤ گے اور ممکن ہے کہ میجر جنرل بھی بن جاؤ" پھر چند لمحے میری طرف دیکھتے رہے اور بولے "لیکن زندگی صرف یہی کچھ نہیں ہے بلکہ زندگی بہت خوبصورت چیز ہے۔ آپ دنیا میں اپنی زندگی کہیں، کسی بھی رقم کے ساتھ عیش سے گزار سکتے ہیں"

میں نے یہ سن کر بے حد گھٹن محسوس کی اور تھوڑی ہی دیر میں اپنی گھڑی کو دیکھا اور معافی چاہتے ہوئے ان سے اجازت لی کہ مجھے کوئی ضروری کام کرنا تھا۔ میرے اٹھ جانے کے بعد بھٹو صاحب نے میرے متعلق کیا سوچا ہو گا۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میرا ضمیر مجھے آج تک اپنے فرض کو دوسری ہر چیز سے مقدم رکھنے پر ایک خاص مسرت اور سکون بخشتا رہا ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں چونکہ سٹاف کالج نہ جا سکا تھا اور جنرل ضیاء الحق صاحب کے نئے حکم کے تحت میں بریگیڈیئر بھی نہیں بن سکتا تھا اور مجھے پتہ تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ فل کرنل ہی ریٹائر ہوں گا لیکن بھٹو صاحب کے ساتھ اتنا زیادہ دیک رہنے پر اور اپنے فرائض کو ہر شے پر مقدم رکھنے پر اور حکومت کا مجھ پر اس قدر بھروسہ دیکھ کر شاید بھٹو صاحب نے یوں خیال کیا تھا اور پھر اتنی بڑی پیشکش کر دی تھی جسے میں نے بڑے بے لوث انداز میں ٹھکرا دیا تھا۔

بھٹو صاحب کے چشمے اور میری آنکھیں۔ بھٹو صاحب کے پڑھنے والے چشموں کا فریم موٹا اور کالے رنگ کا تھا۔ وہ پڑھتے وقت اسی عینک کا استعمال کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ رات گئے سیل میں گپ بازی کے دوران اپنے اوپر ہونے والی زیادتیوں کا ذکر کر رہے تھے اور مجھے ان زیادتیوں پر بین الاقوامی ردِ عمل بتا رہے تھے۔ اسی موضوع پر ان دنوں کے "ٹائم" رسالے نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے مجھے اس رسالے کی رائے پڑھنے کیلئے کہا۔ چونکہ میں اپنی پڑھنے کی عینک ساتھ نہ لایا تھا مجھے رسالے کی عبارت پڑھنے میں دقت ہوئی۔ بھٹو صاحب نے فوراً اپنا چشمہ مجھے دیا کہ لگا کر دیکھئے ممکن ہے ہم دونوں کی نظر ایک جیسی ہو۔ میں نے انکی عینک استعمال کرنے میں کچھ ہچکچاہٹ محسوس کی لیکن ان کے اصرار پر اسے لگا کر پڑھ لیا۔ بعد میں دو یا تین مرتبہ اسی قسم کی حالت میں انہوں نے مجھے اپنی عینک دی جس کی مدد سے میں نے ضروری تحریریں پڑھیں۔ مجھے فخر ہے کہ میں نے ایک بہت بڑے آدمی کی عینک کو اس کی مرضی کے ساتھ استعمال کیا۔

یہ خان:۔ صوبہ سرحد کے ایک خاندان پر بھٹو صاحب نے اپنے خیالات کچھ یوں ظاہر کئے کہ بدقسمتی سے پورا خاندان ہی ہندو نواز ہے۔ ان کی وفاداریاں پہلے تو ہندوستان کے ساتھ ہیں اور پھر افغانستان اور روس کے ساتھ ہیں۔ انہوں نے پاکستان بننے کی بھرپور مخالفت کی اور بدقسمتی سے آج تک یہ لوگ پاکستان کے کھلے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ ان کی اس ملک دشمنی پر ان کے علاقے کے لوگوں کو ان کا محاسبہ کرنا چاہیئے یا کم از کم تمہاری فوجی حکومت کو ہی اس کا خیال کرنا چاہیئے تھا۔ یہ خاندان پاکستان کی تاریخ میں غدّار خاندان کے نام سے یاد کیا جائے گا۔

بھٹو صاحب کی اسیری کے دوران ان کی ایک خاتون جب لندن میں مارک اینڈ سپنسر سٹور سے چوری کے سلسلے میں پکڑی گئی تھی تو بھٹو صاحب نے ان کی اس حرکت پر بہت کچھ کہا تھا لیکن میں اس تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔

سندھو دیش:۔ اگست یا ستمبر 1978ء میں راولپنڈی جیل سپرنٹنڈنٹ چودھری یار محمد نے ایک دن مجھ سے کہا کہ بھٹو صاحب سندھو دیش کی بات کر رہے تھے جس کا میں نے یقین نہ کیا۔ لیکن کچھ مدت کے بعد جب بھٹو صاحب نے ایک دن مجھ سے کہا کہ کرنل رفیع، آپ لوگ پنجاب میں رہیں ہم اپنے لئے سندھو دیش بنائیں گے تو مجھے اس قدر تعجب اور افسوس ہوا کہ میں اس کی تفصیل بیان نہیں کر سکتا۔ بھٹو صاحب سے ایک دو دن بعد دوبارہ ملنے تک میں اسی معاملے پر سوچتا رہا۔ مشرقی پاکستان کا المیہ ہم پر گزر چکا تھا اس لئے اس قسم کے سانحہ کے ہم متحمل نہیں ہو سکتے تھے پھر آج بھٹو جیسا شخص اس طرح کی بات کر رہا تھا۔ ان سے ملنے پر جب میں نے ان کے خیالات پر تعجب اور گلہ کیا تو کہنے لگے میں اپنے آپ کو پاکستان کیلئے اتحاد اور یقین کا نشان یعنی علامت تصور کرتا رہا ہوں اور خاص کر سندھیوں کیلئے۔ اگر مجھے اس جھوٹے اور بناوٹی کیس میں نقصان پہنچایا گیا تو پاکستان میں عموماً اور سندھ میں خصوصاً اتنی گڑبڑ ہو گی کہ مارشل لاء تو کیا کوئی بھی حکومت عوام کو کنٹرول نہ کر سکے گی اور آخر کار پاکستان کو ناقابلِ تلافی نقصان اٹھانا پڑے گا۔ مجھے اس دن انسان کی خود غرضی کی انتہا سمجھ میں آئی۔

جنرل شاہ رفیع عالم کی اچانک سبکدوشی۔ میجر جنرل شاہ رفیع عالم راولپنڈی میں ڈی ایم ایل اے کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ دس کور ہیڈ کوارٹر نے شروع شروع میں سیکورٹی وارڈ کا پلان بنایا تھا لیکن بعد میں ڈی ایم ایل اے نے اس پلان کو تکمیل تک پہنچایا اور 24 مارچ 1979ء تک اس کے ذمہ دار رہے۔ میجر جنرل شاہ رفیع عالم ایک بہادر اور قابل جرنیل تھے۔ 68-1967ء میں جب میں ایس ایس جی کے پیراشوٹ سکول کی کمان کر رہا تھا تو ان دنوں میجر شاہ رفیع عالم بھی پیراجمپ کرنے کے لئے آئے تھے۔ اس زمانے سے میرے ان کے ساتھ اچھے تعلقات رہے ہیں اور وہ میری بڑی عزت کرتے رہے ہیں۔ ہمارے عہدوں میں فرق کے باوجود ہم ایک دوسرے سے کھل کر ملا جلا کرتے تھے۔ وہ ایک کھلے دل و دماغ کے انسان ہیں۔ چونکہ انہوں نے انگریزی ماحول میں پرورش پائی اسلئے ان کا برتاؤ بھی اسی طرز کا رہا ہے، لیکن وہ بڑے قدر شناس اور اچھے شخص ہیں۔ بھٹو صاحب نے ایک دو مرتبہ جنرل شاہ رفیع

عالم کے خاندان کا میرے ساتھ ذکر کیا تھا لیکن میں نے اس کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا تھا۔

مارچ 1979ء میں بیگم نصرت بھٹو اور جنرل شاہ رفیع عالم کی کسی جگہ ملاقات ہوئی۔ ان کے درمیان کیا بات چیت ہوئی مجھے اس کا علم نہیں لیکن جنرل شاہ رفیع عالم صاحب نے اس ملاقات کا ذکر جنرل ضیاء الحق سے نہ کیا۔ شاید جنرل رفیع عالم بھٹو خاندان کی امیدوں پر پورے نہ اترے۔ شاہ رفیع عالم اور بیگم نصرت بھٹو کی ملاقات کے کچھ دن بعد میں 22 مارچ 1979ء کو صبح دس بجے کے لگ بھگ سیکورٹی وارڈ میں گیا۔ جونہی میں بھٹو صاحب کے سیل میں گیا انہوں نے اونچی آواز سے مخاطب ہو کر کہا کہ کرنل جا کر جنرل ضیاء الحق کو بتاؤ کہ اسے باہر کے ملکوں کے اخبار نویسوں کو اس طرح کے بیان نہیں دینے چاہئیں جو آج کل دے رہے ہیں۔ (شاید بی بی سی کی ٹیم کو جنرل ضیاء الحق صاحب نے بیان دیا تھا کہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کے مطابق بھٹو صاحب کو سزا دی جائے گی اور وہ ملک کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے اس میں کوئی تخفیف نہیں کریں گے) کچھ چیزیں خفیہ بھی رکھی جاتی ہیں۔ پھر کہنے لگے کیا میں نے اگلے دن جنرل شاہ رفیع عالم کی ملاقات پر، جو اس نے میری بیگم کے ساتھ کی تھی، کوئی شور مچایا تھا؟ جنرل شاہ رفیع عالم نے جہاں چاہا میری بیگم کو کار میں لے گیا۔ کچھ باتیں خاموشی کے ساتھ صیغۂ راز میں رکھی جاتی ہیں۔ میں خاموش رہا اور جی جناب کہہ کر سیکورٹی وارڈ سے باہر آ گیا۔ مجھے پتہ چل گیا کہ شاہ رفیع عالم صاحب نے بھٹو خاندان کے ساتھ کوئی اندرونی رابطہ قائم کیا ہوا تھا اور اس کو انہوں نے حکومت سے چھپا رکھا تھا۔

میں سیکورٹی وارڈ سے نکل کر سید ھا ڈی ایم ایل اے کے دفتر گیا اور جنرل شاہ رفیع عالم صاحب کو یہ ماجرا سنایا اور کہا کہ عین ممکن ہے کہ انہوں نے اپنی ملاقاتوں کا ذکر سی ایم ایل اے سے نہ کیا لیکن اب تک یہ بات ان تک پہنچ گئی ہوگی۔ جنرل شاہ رفیع عالم بے حد گھبراہٹ کا شکار معلوم ہو رہے تھے۔ وہ اپنے دفتر میں انگیٹھی کے سامنے کھڑے تھے اور میں نے ان سے کہا کہ آپ کو اس قسم کی ملاقات سے اجتناب کرنا چاہئے تھا۔ بہر حال تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اگلے روز مجھے کور ہیڈ کوارٹر بلایا گیا۔ میرے ساتھ کور کمانڈر صاحب بہت اچھی طرح ملا کرتے تھے لیکن اس دن وہ زیادہ ہی مہربان نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے پوچھا کہ جیل کے حالات کیسے ہیں؟ میں نے بتایا کہ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ پھر انہوں نے جنرل شاہ رفیع عالم صاحب کے متعلق پوچھا کہ ان کا برتاؤ کیسا ہے۔ میں نے ان کو بتایا کہ وہ بہت سخت ہیں اور انہوں نے مجھے میرے پنجوں پر رکھا ہوا ہے۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ ان کا رویہ بڑے قیدی کے بارے میں کیسا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ جنرل شاہ رفیع عالم بڑے قیدی کیلئے ہمیشہ سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں اور مجھے ہمیشہ بہت ہوشیار رہنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ کور کمانڈر صاحب نے مجھے نصیحت کی کہ میرے تمام جوانوں اور تمام افسروں کو بہت زیادہ ہوشیار ہونا چاہئے اور مجھے بھی ہر وقت اپنے حواسِ خمسہ بیدار رکھنے کی ضرورت ہے۔ کور ہیڈ کوارٹر سے واپسی پر مجھے پورا علم ہو گیا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اور وہی ہوا۔

اگلے روز یعنی 24 مارچ 1979ء کو معلوم ہوا کہ جنرل شاہ رفیع عالم صاحب ڈی ایم ایل اے کی

ڈیوٹی سے ہٹا دیئے گئے ہیں اور وہ تبدیل ہو کر سیالکوٹ جا رہے ہیں اور جنرل صغیر حسین سید نے ڈی ایم ایل اے کے فرائض سنبھال لئے ہیں۔ یوں ایک بہت اچھے اور قابل جرنیل کے کیریئر کا خاتمہ ہو گیا۔

مجھے چند سال بعد اپنے خفیہ فرائض کے دوران معلوم ہوا کہ ہمیں گلف کے علاقے سے ان دنوں ایک رپورٹ آئی تھی جس کے ذریعے ہمیں دو جرنیلوں کے متعلق خبردار کیا گیا تھا کہ ان کے تعلقات پی پی پی کے ساتھ ہیں اور ہماری خفیہ ایجنسی نے بھی مارشل لاء اتھارٹی کو اس لنک کی اطلاع کر دی تھی بہر حال بھٹو صاحب نے اپنے سیل میں مجھ سے اونچی بات کر کے جنرل شاہ رفیع عالم صاحب کو سبکدوش کروا دیا۔

پاک چین دوستی:۔ ایک دن پاک چین دوستی پر بات چھڑی تو بھٹو صاحب نے کہا چین ایک ایسا ملک ہے جس نے ہماری ہر مشکل گھڑی میں مدد کی اور اپنے آپ کو ہمارا ایک مخلص دوست ثابت کیا۔ حالانکہ دونوں ممالک میں مختلف نظام کام کر رہے ہیں۔ ہمارے ان پڑھ مولوی لاعلمی اور تنگ نظری کی وجہ سے اسلام کو انتہائی بنیاد پرستی کی طرف لے گئے ہیں اور قراقرم کے پار کمیونزم بھی کچھ ایسے ہی حالات سے دوچار رہا ہے مگر دونوں ملکوں کی لیڈر شپ نے جیو پولیٹیکل حالات کو صحیح سمجھا ہے اور ہماری دوستی کی بنیاد صحیح خطوط پر استوار کی ہے۔ پھر کہنے لگے مجھے فخر ہے کہ میں نے اس لازوال دوستی کی بنیاد ڈالی' حالانکہ شروع شروع کے دنوں میں میرے آقا کو چین کی حکومت پر بڑے شکوک و شبہات تھے۔ کہنے لگے وقت نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ چین سے زیادہ کوئی ملک بھی ہمارا خالص' سچا اور بھروسے والا دوست نہیں' ہمیں اس دوستی کو قائم و دائم رکھنا چاہئے۔ اسی موقع پر چین' روس اور امریکہ کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہمیں چین کو کسی سپر پاور کے ساتھ مقابلتاً پرکھنا نہیں چاہئے۔ چونکہ روس بھی ہمارے علاقے میں ایک برتر طاقت ہے اس لئے اس کے ساتھ بھی ہمارے تعلقات اچھے رہنے چاہئیں اور کسی دوسرے ملک کی خاطر ہمیں اس ملک کو ناراض نہیں کرنا چاہئے۔ جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے اس پر بھروسہ کرنا غلطی ہوگی کیونکہ وہ قوم بہت خود غرض ہے اور یہودیوں کے اثر میں ہے، جو صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ پوری اسلامی دنیا کا بد خواہ ہے۔

مسٹر غلام علی میمن کی ناگہانی موت۔ آخری ایام کے دوران جب میں ایک دن سیکورٹی وارڈ بھٹو صاحب کو دیکھنے گیا تو ان کو عام حالت سے زیادہ خاموش اور افسردہ پایا۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے مجھے بتایا کہ مسٹر غلام علی میمن کی اچانک موت ان پر بے حد اثر انداز ہوئی ہے۔ کہنے لگے غلام علی میمن بہت قابل اور ماہر قانون دان تھے' جنہوں نے ان کے کیس کو بڑی محنت اور لگن کے ساتھ لیا ہوا تھا اور شاید ان کی اچانک موت کی ایک وجہ ان کا یہ کیس ہو۔

کچھ نہ لکھنے والی باتیں۔ میں ہمیشہ بھٹو صاحب کے ساتھ بات چیت میں محتاط رہا شروع شروع میں وہ بھی اسی رویئے کو اپنائے رہے۔ ـــــــــ لیکن جونہی ہماری بے تکلفی بڑھی مجھے کبھی کبھار ان کی کچھ باتیں خاص کر ان کے جنسی تجربے سن کر بے حد حیرانی ہوئی۔ ایسی باتیں سن کر میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے ایک فوجی سمجھ کر 'ایک خاص ماحول میں ڈھالنا چاہتے ہوں گے تاکہ میں ان کے ساتھ بالکل فری ہو جاؤں' بلکہ میں کچھ اور بھی محتاط ہو گیا جس کو انہوں نے بھی محسوس کیا اور ایک دو مرتبہ کچھ ریمارکس بھی پاس کئے۔ بہرحال کافی دنوں بعد میں نے محسوس کیا کہ ایک کال کوٹھڑی میں ان جیسے آزاد خیال انسان سے ایسی گفتگو بھی سنی جا سکتی ہے۔ بھٹو صاحب کے ساتھ ان کی زندگی کے بدترین دنوں میں رہتے ہوئے میں نے یہ ضرور اخذ کیا کہ ان کی آزاد خیالی پر کافی کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن اس موضوع پر میں کچھ نہ لکھنا ہی مناسب سمجھوں گا۔ ان دنوں بھٹو صاحب نے کچھ سنجیدہ باتوں کا بھی ذکر کیا لیکن قومی اور ملکی مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے میں اس وقت ان کے متعلق بھی لکھنا پسند نہیں کرتا۔

سپریم کورٹ میں اپیل

نواب محمد احمد خان کے قتل کے جرم میں لاہور ہائیکورٹ نے 18 مارچ 1978ء کو جناب ذوالفقار علی بھٹو کو موت کی سزا سنائی تھی۔ اس کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی گئی تو انتظامیہ نے فیصلہ کیا کہ سماعت کے دوران بھٹو صاحب کو جیل کوٹ لکھپت لاہور سے سنٹرل جیل راولپنڈی منتقل کر دیا جائے تاکہ سپریم کورٹ میں ان کی پیشی کا عمل حکومت کیلئے نسبتاً آسان ہو جائے۔ سپریم کورٹ میں بھٹو صاحب کا لانا' لے جانا' اچھا خاصا مسئلہ بن گیا۔ اس پر انتظامیہ نے کافی غور و فکر کیا کیونکہ عوامی مداخلت سے لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا ہو سکتا تھا۔ اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ بھٹو صاحب کو قیدیوں کی بڑی گاڑی میں پولیس کی بھاری گارد کے ساتھ جیل سے سپریم کورٹ لے جایا جائے گا۔ اس گاڑی کے آگے اور پیچھے دو چھوٹی گاڑیاں ہوں گی۔ ان گاڑیوں کیلئے مندرجہ ذیل راستے مقرر کئے گئے' جن کی طرف ہر سمت سے آنے والے راستے پر پولیس اور دوسری ایجنسیوں کی بھاری تعداد تعینات کی گئی۔

ا) سیدھا راستہ۔ سنٹرل جیل راولپنڈی (پرانی مسمار شدہ جیل) سے گرینڈ ٹرنک روڈ یعنی مال روڈ کے ذریعے سپریم کورٹ جانے والا رستہ' چونکہ سب سے چھوٹا اور بغیر کسی رکاوٹ کے تھا اس لئے اس کو پہلا راستہ چنا گیا۔ علاوہ ازیں یہ راستہ چونکہ چھاؤنی کے علاقہ میں واقع ہے اس لئے اس پر عوام کی بھاری جمعیت کا اکٹھا ہونا ممکن نہ تھا۔

ب) جیل سے لالکڑتی کا راستہ:۔ حالانکہ اس راستے پر کچھ موڑ ہیں لیکن پھر بھی چھاؤنی سے گزرنے

کی وجہ سے کافی محفوظ ہے۔ یہ راستہ جیل گیٹ سے سی او اے ایس ہاؤس (آرمی ہاؤس) پھر سی او ڈی کے مرکزی گیٹ کے سامنے سے لالکڑتی اور جی ایچ کیو کے سامنے سے ہوتا ہوا ایم ایچ ہسپتال سے سپریم کورٹ تک پھیلا ہوا ہے۔ بھٹو صاحب دو بار سپریم کورٹ لے جائے گئے اور ہر دفعہ جانے کیلئے یہی راستہ استعمال کیا گیا جبکہ ہر بار واپسی پر راستہ (ا) یعنی مال روڈ کا راستہ استعمال کیا گیا۔

ج) تیسرا راستہ۔ یہ راستہ کافی لمبا تھا لیکن دوسرے دو راستوں کے غیر محفوظ ہونے کی صورت میں استعمال کیا جانا تھا۔ جیل سے ایئرپورٹ چکلالہ ' فیض آباد ' پیرودھائی ' پشاور روڈ سے سپریم کورٹ کا راستہ۔ اس راستے پر لیول کراسنگ سے گزرنے کیلئے خاص انتظام کیا گیا تھا۔

سپریم کورٹ میں پیشی کے دنوں میں پولیس کی کافی نفری ان تینوں راستوں کی دیکھ بھال پر مامور کی گئی تھی مگر کسی جگہ کسی اجتماع کی اطلاع نہیں ملی۔ صرف سپریم کورٹ میں وکلاء ' پی پی پی کے کچھ لوگ اور اخباری نمائندے آئے تھے۔ پہلے دن جب بھٹو صاحب کو جیل سے لے جانے کیلئے قیدیوں کی بڑی گاڑی میں بٹھایا گیا تو انہوں نے کچھ ناراضگی کا اظہار کیا مگر دوسرے روز خاموشی سے اسی گاڑی میں سوار ہو گئے تھے۔

سپریم کورٹ میں بھٹو صاحب نے اچھی خاصی تقریر کر کے اپنے دلائل پیش کئے لیکن ان پر میں کوئی رائے زنی نہیں کروں گا اور نہ ہی پنجاب ہائیکورٹ میں ان کے مقدمے پر کچھ لکھوں گا کیونکہ یہ دونوں مقدمے کھلے عام چلے اور ان پر پریس نے کافی کچھ لکھا۔ اسی طرح بھٹو صاحب کی پھانسی کا فیصلہ بھی چونکہ ملک کی دو ممتاز ترین کورٹس نے کیا تھا جو پریس میں پوری طرح شائع ہوا تھا میں اس پر کوئی رائے زنی نہیں کر سکتا۔ البتہ سپریم کورٹ میں اپیل کی سماعت کے دوران انتظامیہ نے جو کچھ کیا یا مجھے جو ' جو احکامات دیئے گئے ان کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔

سپریم کورٹ کا بھٹو صاحب کی اپیل پر فیصلہ 6 فروری 1979ء کو آنے کی امید تھی اس لئے 5 فروری کو مجھے کہا گیا کہ میں صبح آٹھ بج کر 45 منٹ پر ڈی ایم ایل اے کے دفتر آ جاؤں۔ مقررہ وقت پر جب میں جنرل شاہ رفیع عالم (ڈی ایم ایل اے) کے دفتر پہنچا تو وہ اندر موجود نہیں تھے اسلئے میں ان کے اے ڈی سی کے ساتھ استقبالیہ میں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد جنرل صاحب آتے دکھائی دیئے مگر وہ کچھ اضطراب کی حالت میں تھے۔ وہ اندر داخل ہو ہی رہے تھے کہ واپس اپنی رہائش گاہ کی طرف چل دیئے۔ چند قدم جانے کے بعد انہوں نے مڑ کر مجھے بلایا۔ جونہی میں ان کے پاس پہنچا انہوں نے کہا۔ رفیع ' ایک حرامزادہ جو سپاہی کی وردی میں (لانس نائیک) تھا ' سپریم کورٹ میں داخل ہوا اور بلند آواز میں کہا کہ اگر بھٹو صاحب کو کچھ ہوا تو میں تمام ججوں اور جرنیلوں کو ختم کر دوں گا۔ انہوں نے کہا کہ میں فوراً سپریم کورٹ جا کر ایس ایم ایل اے یا ایس ایس پی کو ملوں اور ان سے کہوں کہ سرگوشیوں کے ذریعے وہ لوگوں کو کورٹس میں بتائیں کہ پیپلز پارٹی کا آدمی فوجی جوان کی وردی پہن کر اندر آیا اور اس نے یہ حرکت کی ہے۔

میں نے انہیں سلام کیا اور فوراً باہر کھڑی جیپ کی طرف جا کر خود ہی چلاتے ہوئے سپریم کورٹ کا رخ کیا۔ میں بے حد تیزی سے جیپ دوڑاتا ہوا' ٹریفک سگنل کی پروا کئے بغیر چند ہی منٹوں میں سپریم کورٹ کے سامنے جا پہنچا جہاں کافی اخباری نمائندے' خاص کر بیرونی ممالک کے نمائندے کھڑے تھے۔ میں نے جیپ کو سڑک کی ایک طرف روکا اور ڈرائیور سے کہا کہ وہ اسے پارک کرے اور میں سیدھا کورٹ کے احاطے میں چلا گیا۔ چونکہ میں وردی میں تھا اور دو دن پہلے ایس ایم ایل اے اور ایس ایس پی کے ساتھ سپریم کورٹ میں بھٹو صاحب کی پیشی کے سلسلے میں حفاظتی انتظامات دیکھنے گیا تھا اس لئے گیٹ پر سنتری نے بلا روک ٹوک گیٹ کھول دیا اور مجھے اندر جانے دیا۔ میں نے ڈیوٹی پر کھڑے پولیس انسپکٹر سے کہا کہ اندر سے ایس ایس پی مسٹر برکی یا اے ایس پی اسلام آباد مسٹر آصف کو باہر بلائیں۔ چند لمحوں میں مسٹر آصف باہر آئے۔ ان کو میں نے جنرل شاہ رفیع عالم کی خواہش بتائی' جنہوں نے مجھے یقین دلایا کہ ہر ممکن طریقے سے اندر لوگوں کو بتا دیا جائے گا۔ میں واپس باہر کھڑی جیپ کو چلاتے ہوئے اسی رفتار اور تیزی سے ڈی ایم ایل اے کے دفتر پہنچا اور ان کو بتایا کہ ان کا حکم پہنچا دیا ہے۔ مجھے شاید زیادہ سے زیادہ دس منٹ لگے ہوں گے۔ اس لئے جنرل صاحب بے حد خوش ہوئے اور مجھے شاباش دی۔ میں ان کے ساتھ ان کے دفتر میں ہی بیٹھ گیا اور چائے اور گپ شپ چل رہی تھی کہ جنرل صاحب کا ٹیلیفون بجنے لگا۔ انہیں بتایا گیا کہ سپریم کورٹ نے مسٹر بھٹو کی اپیل نامنظور کر دی ہے اور انہیں یہ بھی بتایا گیا کہ بھٹو صاحب کے ساتھ دوسرے قیدیوں کی اپیلیں بھی اتفاق رائے کے ساتھ نامنظور کر دی گئی ہیں۔ میں اس ٹیلیفون کی بات چیت سے یہ سمجھا کہ شاید بھٹو صاحب کی اپیل بھی سپریم کورٹ نے اتفاق رائے سے ہی نامنظور کر دی ہے۔ جنرل صاحب نے ٹیلیفون بند کرنے کے بعد مجھے بتایا کہ اپیل نامنظور ہو چکی ہے اور مجھے پچھلے دن کے بتائے ہوئے احکامات پر فوراً عمل کرنا چاہئے۔ میں وہاں سے جیل سپرنٹنڈنٹ کے دفتر گیا جہاں وہ انتظار میں بیٹھا تھا۔ جاتے ہی انہوں نے مجھ سے پوچھا "کوئی خبر؟" میں نے انہیں بتایا کہ سپریم کورٹ نے بھٹو صاحب اور دوسرے قیدیوں کی اپیل نامنظور کر دی ہے۔ جیل کے حکام نے جونہی یہ خبر سنی ان میں زندگی واپس آ گئی کیونکہ اگر بھٹو صاحب کی اپیل منظور ہو گئی ہوتی تو شاید ان کے لئے زمین تنگ ہو جاتی۔ یار محمد صاحب نے چائے کیلئے کہا اور ہم آئندہ کے ایّام کے متعلق سوچنے لگے۔ تقریباً گیارہ بجے کے قریب یار محمد صاحب نے مجھے کہا کہ کیوں نہ جا کر بھٹو صاحب کو اطلاع دی جائے۔ ہم دونوں سیکورٹی وارڈ گئے جہاں بھٹو صاحب ایک خاص سوچ میں بیٹھے نظر آئے۔ یار محمد صاحب نے اظہار افسوس کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ سپریم کورٹ نے ان کی اپیل نامنظور کر دی ہے۔ بھٹو صاحب نے ان کی یہ بات سن کر کوئی خاص ردِّ عمل ظاہر نہ کیا' بلکہ کہنے لگے ہاں یہ تو مجھے اندازہ ہو ہی چکا تھا کہ اپیل نامنظور ہو گئی ہے ورنہ کوئی نہ کوئی بھاگا ہوا آتا اور مجھے ساڑھے نو اور دس بجے کے درمیان بتاتا۔ البتہ جب یار محمد صاحب نے بھٹو صاحب کو اپیل کے رد ہونے کی خبر دی تو ان کے چہرے پر میں نے ایک خاص اندرونی درد کی کیفیت دیکھی۔ انہوں نے پھر

فوراً پوچھا کہ کیا یہ کورٹ کا متفقہ فیصلہ تھا؟ چونکہ میں نے جنرل شاہ رفیع عالم صاحب کے دفتر میں ٹیلیفون کی بات چیت سے یہی اندازہ لگایا تھا کہ یہ سپریم کورٹ کا متفقہ فیصلہ تھا (دراصل دوسرے قیدیوں کے متعلق کورٹ کا متفقہ فیصلہ ہوا تھا اور بھٹو صاحب کے متعلق تین/ چار کا فیصلہ تھا) اور جیل سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں 'میں نے ان کو یوں ہی بتایا تھا' اسلئے انہوں نے بھٹو صاحب کو بتایا کہ وہ جج صاحبان کا متفقہ فیصلہ تھا۔ جس پر انہوں نے کچھ تعجب کا اظہار ظاہر کیا' مگر خاموش رہے۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا کہ باہر بڑا اچھا موسم ہے اور باہر کورٹ یارڈ میں کیوں نہ بیٹھا جائے۔ باہر کرسیاں بچھائی گئیں اور ہم تینوں دھوپ میں بیٹھ گئے۔ بھٹو صاحب نے مجھ سے کافی یا چائے کے لئے پوچھا۔ میں نے وہی جواب دیا کہ جناب جو آپ نوش کرنا چاہیں۔ انہوں نے مشقتی عبدالرحمٰن سے کہا کہ کافی لائے۔ ہم تینوں خاموشی سے بیٹھ گئے کیونکہ حالت ہی کچھ ایسی تھی' لیکن بھٹو صاحب نے اپنے آپ پر کمال کنٹرول دکھایا اور ایسا محسوس ہوا کہ اس بُری خبر کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا اور بالکل ڈھیلے ڈھالے موڈ میں اپنے آپ کو ظاہر کیا' جیسے کہ ان کو ذرہ بھر پروا نہیں ہوئی' جس نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ بلکہ وہ اور زیادہ زندہ دلی کے موڈ میں نظر آنے لگے اور جب یار محمد نے ان کی چرب زبانی کی تعریف کی تو کہنے لگے۔ یار محمد ہم نے اس زبان کو بڑے طریقوں سے استعمال کیا ہے۔ وہ کچھ زیادہ ہی ہلکے پھلکے موڈ میں معلوم ہوئے اور میں اس سوچ میں تھا کہ جیسے ان کو سپریم کورٹ کی طرف سے اپیل کی منظوری کی خبر دی گئی ہو۔ باتوں باتوں میں انہوں نے چودھری یار محمد سے کہا کہ وہ انہیں کب پھانسی لگا رہا ہے اور پھر کہنے لگے ہم تو اللہ تعالیٰ کے پاس جا رہے ہیں۔ ہم نے اس دنیا میں خوب عیش دیکھا ہے۔ اب کوئی پروا نہیں ہے' ہم نے جو چاہا اسے پایا (وغیرہ وغیرہ) لیکن یہ سب کچھ طنزیہ طور پر کہہ رہے تھے۔ بہرحال ان کے رویّہ نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ پھر کہنے لگے بھئی میرے چند دن رہ گئے ہیں اسلئے مجھے آرام سے رہنے دیا جائے اور خواہ مخواہ یہ نہ کہا جائے کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو وغیرہ وغیرہ' کیونکہ اس طرح میری توہین ہوتی ہے۔ پھر میرے نزدیک ہو کر میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا کہ براہِ مہربانی ہر تبدیلی کے متعلق انہیں بتایا جائے' خاص کر اگر انہیں کسی اور جگہ منتقل کیا جا رہا ہو۔ میں نے وعدہ کے طور پر اپنا سر ہلایا۔ تقریباً پونے بارہ بجے کورٹ یارڈ کے ایک کونے کے خیمے میں لگا ہوا ٹیلیفون بجا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ نے جا کر اسے سنا۔ واپس آتے ہی انہوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ڈیوٹی افسر نے کہا ہے کہ بیگم نصرت بھٹو جیل کے گیٹ پر کھڑی ہیں کیا انہیں اندر آنے کی اجازت ہے؟ میں ایک اچنبھے میں پڑ گیا کیونکہ پرانے پروگرام کے مطابق بیگم بھٹو صاحبہ کو 6 فروری کو جیل میں مسٹر بھٹو سے ملنے آنا تھا۔ مگر 5 فروری کو مجھے ایس ایم ایل اے نے حکم دیا تھا کہ چونکہ بیگم بھٹو کو 5 اور 6 فروری رات کو ہاؤس ارسٹ (House Arrest) کر دیا جائے گا اس لئے ان کو پراچہ ہاؤس اسلام آباد سے باہر نہیں آنے دیا جائے گا اور ان کی 6 فروری والی ملاقات نہیں کرائی جائے گی۔ میں ایک عجیب حالت میں تھا پھر جونہی میں نے بھٹو صاحب کی طرف نگاہ اٹھائی تو ان کی آنکھوں میں ایک خاص

کیفیت دیکھی چونکہ اس دن ان کی اپیل نامنظور ہو چکی تھی اور حالات عجیب و غریب پلٹا کھا رہے تھے اس لئے میں نے چودھری یار محمد سے کہا' انہیں اندر آنے دو۔ تھوڑی دیر میں بیگم نصرت بھٹو ساری دنیا کو برا بھلا کہتے ہوئے نمودار ہوئیں۔ میں نے اٹھ کر ان کو سلام کیا اور انہیں اپنی کرسی پر بیٹھنے کو کہا جبکہ فوراً مشقتی ایک اور کرسی بھی لے آیا۔ جناب بھٹو صاحب نے ان کو صبر کی تلقین کی مگر وہ کافی غصے میں تھیں۔ انہوں نے اپیل کی نامنظوری کی خبر دی اور بھٹو صاحب کو بتایا کہ فلاں فلاں (نازیبا الفاظ استعمال کرتے ہوئے) نے ان کے خلاف فیصلہ دیا۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ خیمے میں رکھا ہوا ٹیلیفون پھر بجنے لگا۔ چودھری یار محمد نے اٹھ کر ٹیلیفون سنا اور آ کر مجھے بتایا کہ میں ایس ایم ایل اے صاحب سے بات کروں۔ میں نے بریگیڈیئر خواجہ راحت لطیف صاحب کو ڈیوڑھی کے اوپر والی چوکی سے ٹیلیفون کرتے ہوئے دیکھ لیا اور چونکہ خلائی فاصلہ 50 گز سے بھی کم تھا اور ان کی اونچی آواز بھی کسی قدر سنائی دے رہی تھی۔ وہ بے حد ناراضگی کے عالم میں تھے اور مجھے کہنے لگے کہ میں نے ان کی حکم عدولی کی ہے اور صاف صاف احکامات کے باوجود بیگم بھٹو کو جیل میں کیوں آنے دیا گیا ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ جیل کے گیٹ اور شارع عام پر ایک تماشہ بنانے کی بجائے میں نے بیگم بھٹو کو اندر آنے کی اجازت دی ہے۔ انہوں نے مجھے حکم دیا کہ فوراً بیگم بھٹو کو باہر نکال دیا جائے۔ میں جی جناب کہ کر واپس آیا اور خاموشی سے مسٹر بھٹو' بیگم بھٹو اور یار محمد کے ساتھ بیٹھ گیا۔ چونکہ بھٹو صاحب نے ہمارے درمیان ساری گفتگو سن ہی لی تھی' انہوں نے مجھ سے افسوس کا اظہار کیا کہ انہوں نے مجھے ناخوشگوار حالت سے دوچار کر دیا ہے۔ جواباً میں نے ان سے کہا کہ کوئی بات نہیں اور بیگم نصرت بھٹو سے درخواست کی کہ وہ واپس تشریف لے جائیں مگر بیگم صاحبہ نے جواب دیا کہ وہ اتنی جلدی واپس نہیں جائیں گی۔ تقریباً دو تین منٹوں میں مجھے پھر ٹیلیفون پر بلایا گیا اور پوچھا گیا کہ بیگم بھٹو ابھی تک باہر کیوں نہیں آئیں۔ میں نے جواب دیا کہ وہ چائے پی کر باہر آ رہی ہیں۔ بریگیڈیئر صاحب بے حد غصے میں تھے اور انہوں نے مجھے حکم دیا کہ بیگم بھٹو کو فوراً باہر نکال دو اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ لیڈی پولیس سیکورٹی وارڈ میں اندر آ رہی ہے جو بیگم بھٹو کو زبردستی (Man Handle) کر کے باہر لائے گی۔ میں نے ان سے کہا کہ بیگم بھٹو خود باہر آ رہی ہیں اس لئے لیڈی پولیس کی ضرورت نہیں۔ پھر خیمے سے باہر آ کر میں نے ہیڈوارڈر سے کہا کہ کوئی بھی سیکورٹی وارڈ والے جنگلے کے اندر نہیں آ سکتا اور اس گیٹ کا تالا نہیں کھولا جائے گا۔ اس دوران بیگم اور بھٹو صاحب اندر سیل میں چلے گئے۔ میں ہیڈوارڈر کو ہدایت دے کر کورٹ یارڈ سے اندر سیل میں گیا۔ بیگم صاحبہ کے ہاتھ میں چائے کا پیالہ تھا جسے وہ نوش کر رہی تھیں۔ بھٹو صاحب ان سے کہ رہے تھے کہ وہ واپس چلی جائیں۔ میں نے بیگم صاحبہ کے نزدیک بیٹھتے ہوئے ان سے کہا اللہ تعالیٰ بہت بڑا اور رحیم و کریم ہے آپ لوگ رب العزت سے معافی مانگیں اور رحم کی دعا کریں۔ بیگم صاحبہ بے حد طیش میں تھیں' کہنے لگیں کہ کیا ہم بڑے نہیں ہیں (? Are we not Great) مجھے ان کے جواب پر بے حد حیرانی اور افسوس ہوا اور میں نے ان سے

کہا کہ محترمہ آپ اپنے آپ کو اس طرح کے مقابلے میں نہ لائیں۔ میرے خیال میں بیگم بھٹو اتنے غصے اور طیش میں تھیں کہ یہ الفاظ بے اختیار ان کے منہ سے نکل گئے۔ بہر حال انہوں نے اپنی پہلی انگلی اپنی کن پٹی کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بہت بڑا دماغ دیا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ محترمہ آپ یہاں سے تشریف لے جائیں۔ وہ اور زیادہ طیش میں آ گئیں۔ چونکہ ایس ایم ایل اے بے حد ناراض ہو رہے تھے اور زنانہ پولیس اندر بھیجنے کو کہہ رہے تھے ادھر بیگم بھٹو بھی آپے سے باہر ہو رہی تھیں تو شاید میں نے اونچی آواز میں ان سے کہا کہ براہِ مہربانی میری مجبوری کو دیکھئے اور آپ فوراً باہر چلی جائیں۔ بھٹو صاحب نے بھی بڑی دھیمی آواز میں ان سے بار بار کہا کہ وہ واپس چلی جائیں۔ تب انہوں نے کہا کہ میں جاتی ہوں مگر چائے ختم ہونے پر۔ میں سیل سے اور پھر سیکورٹی وارڈ سے باہر آیا تو دیکھا کہ بریگیڈیئر راحت لطیف صاحب بمع چند زنانہ پولیس تار والے جنگلے کے گیٹ پر کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے زور سے مجھے پکارا اور گیٹ کا تالا کھولنے کا حکم دیا۔ میں ان کی طرف لپکا اور ان سے کہا کہ بیگم بھٹو باہر آ رہی ہیں۔ انہوں نے اپنی لال فیتے والی ٹوپی سر سے اتار کر بغل میں دباتے ہوئے بھاگ کر ڈیوڑھی کا رخ کیا اور میں جونہی سیکورٹی وارڈ کے اندر جانے کو واپس ہوا تو بیگم بھٹو بھی باہر آ رہی تھیں۔ ڈیوڑھی میں کھڑی گاڑی پر زنانہ پولیس نے انہیں گاڑی میں ڈالا اور ان کو جیل سے باہر لے گئی۔

بعد میں، مَیں نے لاکھ کوشش کی اور حالات بتانے کی سعی کی مگر ایس ایم ایل اے کا یقین مجھ سے اٹھ چکا تھا۔ اسی شام ڈی ایم ایل اے نے اپنے دفتر میں مجھے بلا بھیجا جہاں ایس ایم ایل اے، کمشنر راولپنڈی ڈویژن، ڈپٹی کمشنر راولپنڈی، ڈی آئی جی پولیس راولپنڈی رینج، ایس ایس پی راولپنڈی اور ایس پی اسلام آباد بھی کانفرنس کے لئے آئے ہوئے تھے۔ کانفرنس کے شروع ہی میں ڈی آئی جی پولیس نے کہا بیگم بھٹو جیل کے اندر کیسے چلی گئیں۔ پیشتر اس کے کہ مجھ سے جواب دینے کو کہا جاتا ڈی ایم ایل اے، جنرل شاہ رفیع عالم نے انہیں غصے ہوتے ہوئے کہا یہ فیصلہ حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے کرنل رفیع کا تھا مگر ان سے پوچھا کہ آپ (ڈی آئی جی پولیس) یہ بتائیں کہ بیگم بھٹو پولیس کی اتنی بڑی گارد کے باوجود اسلام آباد جس گھر (پراچہ ہاؤس) میں زیرِ حراست تھیں وہاں سے بھاگ نکلنے میں کیسے کامیاب ہوئیں اور پھر پنڈی اور اسلام آباد کی پولیس کو ہوشیار کرنے کے باوجود جیل تک پہنچنے میں کس طرح کامیاب ہوئیں۔ جنرل صاحب نے پولیس کی کافی کٹ لگائی اور انتظامیہ کو خبردار کیا کہ آئندہ کیسا وقت آ رہا ہے اور کتنی ہوشیاری کی ضرورت ہو گی۔ اس کانفرنس کے بعد مجھے ایس ایم ایل اے کے سامنے دوبارہ اپنی صفائی پیش کرنی پڑی۔

جب میں 8 فروری کو دوبارہ سیکورٹی وارڈ میں گیا تو بھٹو صاحب کچھ خاموش خاموش تھے اور کچھ دیر بعد انہوں نے گلہ کیا کہ میں نے ان کی بیگم صاحبہ سے چلّا کر کہا تھا کہ فوراً واپس چلی جائیں، میں نے انہیں پورا قصہ سنایا اور اس وقت تک جو مجھ پر گزری تھی وہ روئیداد بھی بیان کی اور ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ ان

کے ایک خاص نظر سے مجھے دیکھنے پر میں نے حکامِ بالا کی حکم عدولی کی اور بیگم صاحبہ کو اندر آنے کی اجازت دی اور پھر سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ باہر زنانہ پولیس کھڑی تھی ادھر بیگم صاحبہ باہر نہ جانے پر بضد تھیں اور میں یہ کسی حالت میں نہ چاہتا تھا کہ ماضی کی خاتونِ اول آپ کی آنکھوں کے سامنے پولیس فورس سے دست و گریباں ہو۔ میں نے ان سے صاف صاف کہا کہ جناب کیا میرا چلّانا آپ کی خیر خواہی (Good faith) میں نہ تھا جس پر انہوں نے اپنا سر ہلا کر میری حوصلہ افزائی کی اور بعد میں میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے ان کی وجہ سے اتنی تکلیف اٹھائی اور مجھے جواب طلبی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی موقع پر انہوں نے مجھ سے شکایت کی کہ جیل کے لوگ ان سے اب اچھا سلوک نہیں کر رہے اور مجھ سے کہنے لگے کہ یہ ان کی بے عزتی ہے۔ میں نے ان کو حالات کے متعلق سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس وقت ہوا کا رخ تبدیل ہو چکا تھا اور جیل والے کسی قسم کی بات سننے کے موڈ میں نہ تھے۔

نظرِ ثانی اور رحم کی اپیل:۔ 22 مارچ 1979ء کو جب میں بھٹو صاحب سے ملا تو انہوں نے جیل حکام کے خلاف کافی شکایات کیں۔ میں نے ان کو بتایا کہ میں اب اس پوزیشن میں نہیں ہوں جس میں پہلے تھا اور جیل حکام پر بھی کافی سختی کی جا رہی ہے کیونکہ حکامِ بالا ہر لحہ متفکر ہونے کی وجہ سے سیکورٹی وارڈ کا خاص خیال رکھ رہے ہیں اور جیل حکام کو قانونی طور پر مجبور کر رہے ہیں کہ وہ کتابی احکامات کے مطابق سختی سے کام چلائیں۔ میں نے بھٹو صاحب کو صبر کی تلقین کی۔ ان دنوں بھٹو صاحب ٹہلائی کے لئے سیل سے باہر بہت کم نکلتے تھے۔ وہ کہنے لگے ایک عام وارڈر بھی مجھے حکم دیتا ہے کہ وقت ختم ہو گیا ہے اور اندر سیل میں چلیں وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ایسا برتاؤ برداشت نہیں کر سکتے۔

اس دن باتوں باتوں میں بھٹو صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ سپریم کورٹ میں نظرِ ثانی اپیل کا کیا فیصلہ ہو سکتا ہے۔میں نے اپنی لاعلمی کا ذکر کیا۔ پھر انہوں نے خود ہی کہا کہ شاید کورٹ 25 مارچ کو اپنا فیصلہ سنائے جو اپیل جیسا ہی ہو گا یعنی تین / چار کا فیصلہ ہو گا۔ چونکہ میرا سپریم کورٹ کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ہی میرے حلقۂ احباب میں کبھی اس کا ذکر ہوا تھا اس لئے مجھے کوئی علم نہ تھا۔ نظرِ ثانی اپیل کا فیصلہ 24 مارچ 1979ء کو سنایا گیا اور یہ بھی نامنظور ہوا۔ نظرِ ثانی اپیل کے فیصلے کا اعلان ہوتے ہی مجھے اور جیل سپرنٹنڈنٹ کو مندرجہ ذیل احکامات پر عمل کرنے کا حکم ملا!

1۔ مسٹر بھٹو کو عام پھانسی والے مجرم کی طرح سمجھا جائے گا اور ان کے ساتھ قانون کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔

2۔ ملاقاتیوں کی ان کے ساتھ ملاقات باقاعدہ قانون کے مطابق ہو گی جس کی میعاد صرف آدھ گھنٹہ ہو گی۔

3۔ تمام ملاقاتیوں کی تلاشی لی جائے گی، بہر حال چونکہ سپریم کورٹ نے پہلے اس سلسلہ میں نرمی برتنے کی ہدایت کی تھی اس لئے حکومت کا فیصلہ معلوم کر کے بتایا جائے گا۔

4۔ جیل میں باہر سے طعام کالانا بند کر دیا جائے گا۔ پہلے کھانا پرا چہ ہاؤس اسلام آباد سے آتا تھا اور 5 فروری 1979ء سے ڈاکٹر ظفر نیازی کے گھر سے آرہا تھا۔

5۔ کھانے کا بندوبست سیکورٹی وارڈ میں ہی کیا جائے گا اور اگلے حکم تک قیدیوں کے لنگر کی بجائے اندر سیکورٹی وارڈ کے کچن میں ہی کھانا تیار کیا جائے گا۔

6۔ بھٹو صاحب کے سیل سے نوار والا پلنگ اٹھالیا جائے اور لوہے کے سپرنگوں والا بستر دیدیا جائے۔

7۔ بجلی کی روشنی والے بٹن (Switches) ان کے سیل سے باہر دالان (Corridor) میں منتقل کر دیئے جائیں اور ان کو باہر ہی سے جلایا اور بجھایا جائے گا۔

8۔ بھٹو صاحب پر سنتری کی نگاہ رات دن رہے گی جو ان کے سیل کے دروازے میں کھڑا رہے گا۔

9۔ ان کے سیل سے تمام ادویات وغیرہ وغیرہ باہر نکال لی جائیں گی۔

10۔ سیکورٹی وارڈ سے فریج نکال کر انہیں اس سہولت سے محروم کر دیا جائے۔

11۔ ملاقات صرف 30 منٹ کی ہو گی اور ملاقاتی آہنی گیٹ سے باہر رہے گا اور ملاقات کے دوران گارڈ سٹینڈ ٹو (Stand to) رہے گی۔

12۔ ٹہلائی کا وقت صرف آدھ گھنٹہ ہو گا اور اس دوران بھی گارڈ سٹینڈ ٹو رہے گی۔

13۔ البتہ' اخبارات وغیرہ پہلے کی طرح انہیں دیئے جاتے رہیں گے۔

14۔ رات کے وقت فیلڈ افسر جو سیکورٹی بٹالین سے ہو گا آپریشن روم میں ڈیوٹی پر تعینات رہے گا تاکہ سیکورٹی کو یقینی بنایا جائے۔

مندرجہ بالا احکامات نے بہت بڑا مسئلہ کھڑا کر دیا کیونکہ بھٹو صاحب ان باتوں پر عمل کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔ بہرحال احکامات پر عملدر آمد تو ہونا ہی تھا۔ جیل حکام نے فوراً عمل شروع کر دیا۔ نوار کی چارپائی کو ان کے سیل سے نکال دیا گیا' لیکن بھٹو صاحب نے لوہے کی چارپائی اندر نہ ڈالنے دی اور گدا سیل کے فرش پر ہی بچھالیا۔ انہوں نے اپنی ادویات اور حجامت کا سامان سیل سے باہر نہ نکالنے دیا۔ جیل حکام نے فیصلہ کیا کہ جب وہ غسل خانے میں جائیں گے تو یہ چیزیں ان کے سیل سے نکال لی جائیں گی۔ یا تو انہوں نے یہ بات سن لی یا پھر کسی نے کسی طرح ان کو بتادی۔ اس لئے وہ غسل خانے سے کموڈ جو لکڑی کا ڈبہ ہی تھا جا کر خود اٹھالائے اور اسے سیل کے ایک کونے میں رکھ دیا۔ اور پھر سیل سے باہر نکلنے پر رضامند ہی نہ ہوئے۔ جب جیل حکام نے یہ دیکھا تو چند وارڈر اکٹھے کئے گئے اور سیکورٹی وارڈ میں لے جا کر ان کو دالان میں حکم دیا گیا کہ کارروائی ہر حالت میں کی جائے گی۔ بھٹو صاحب نے جب یہ حالت دیکھی تو ایک بے بس انسان کی طرح خاموش رہے اور اس طرح جیل حکام نے ان کے سیل سے ان کی ادویات وغیرہ اور حجامت کا سامان نکال لیا۔ اسی وقت بجلی کے سوئچ وغیرہ بھی باہر منتقل کر دیئے گئے۔ وہ اس کارروائی

پر بے حد غضبناک ہوئے مگر ساتھ ہی ساتھ بے بسی کا عالم بھی تھا۔ قہرِ درویش بر جانِ درویش والی بات ہوئی۔ جب وہ اور کچھ نہ کر سکے تو انہوں نے 24 مارچ دن کو بھوک ہڑتال کر دی۔ انہوں نے 23 مارچ شام کو کھانا کھایا تھا اس کے بعد انہوں نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ انہوں نے نو (9) دن بھوک ہڑتال کی اور اس طرح 24 مارچ سے یکم اپریل 1979ء کی شام تک انہوں نے نہ تو کچھ کھایا نہ پیا۔ اس دوران میں ان کو جا کر نہ دیکھ سکا کیونکہ مجھے حکم مل گیا تھا کہ میں ان کو اکیلا نہیں مل سکتا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ اور میں دونوں اکٹھے صرف خاص حکم پر بھٹو صاحب کے سیل میں جائیں گے۔ ورنہ اگر میں ان کو ان دنوں میں اکیلا مل سکتا تو شاید ان کو کچھ کھانے پینے پر آمادہ کر سکتا اور انہوں نے جو اتنی لمبی بھوک ہڑتال کی اور بے حد کمزور ہو گئے تھے میں اس کا کچھ نہ کچھ سدِّباب کر سکتا۔ 29 مارچ 1979ء کو مسٹر پیرزادہ 'جو ان کے کونسلر بھی تھے' ان سے ملنے جیل کے دفتر میں آئے۔ مجھے بتایا گیا کہ مسٹر بھٹو صرف ایک تولیہ اپنے اردگرد لپیٹے ہوئے ہیں 'کیونکہ انہوں نے اپنے کپڑے خود دھوئے ہیں اور وہ سوکھ رہے ہیں۔ انہیں جیل حکام نے بتایا کہ مسٹر پیرزادہ انتظار میں بیٹھے ہیں تب انہوں نے اپنے دھوئے ہوئے کپڑے استری کیلئے دیئے جو آدھے خشک اور کچھ گیلے ہی تھے 'پہن کر مسٹر پیرزادہ سے ملے۔ مجھے اس دن بتایا گیا کہ ان کی حالت بے حد خراب اور کمزور تھی لیکن میں جیل کے دفتر سے ان کے سیل تک نہ جا سکتا تھا کیونکہ میں ایس ایم ایل اے کے احکامات کی پابندی پر مجبور تھا۔

رحم کی اپیل:۔ سپریم کورٹ میں نظرِ ثانی اپیل کی نامنظوری کے بعد پاکستان پیپلز پارٹی کے ایکٹنگ جنرل سیکرٹری مسٹر وٹو نے کورٹ میں رحم کی اپیل کی درخواست دائر کی 'لیکن اس کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلے والی کوشش کا ہوا تھا۔ بلکہ رحم کی اپیل کا اخبارات میں کوئی خاص ذکر تک نہ ہوا۔ ادھر بھٹو صاحب کی حالت جیل میں بد سے بدتر ہو رہی تھی مگر اس شخص نے ذرہ بھر پروا نہ کی اور تمام تکالیف جھیلتا رہا اور اپنے طریقے سے لڑائی لڑتا رہا۔

اگر بھٹو صاحب کی اپیل سپریم کورٹ میں منظور ہو بھی جاتی تو بھی انہیں آزاد نہ کیا جاتا!

5 فروری 1979ء کو دس بجے صبح مجھے ایس ایم ایل اے کے ساتھ ڈی ایم ایل اے کے دفتر بلایا گیا' جہاں ہمیں بتایا گیا کہ شاید کل' مورخہ 6 فروری کو سپریم کورٹ۔ بھٹو صاحب کی اپیل منظور کرنے کے بعد حکم جاری کرے کہ ان کو آزاد کر دیا جائے مگر ایسے حکم کے باوجود بھی ان کو جیل سے باہر نہیں جانے دیا جائے گا اور وہ مارشل لاء کے تحت کئی اور مقدمات میں مطلوب ہیں جن کے تحت ان پر الگ مقدمہ چلایا جائے گا۔ مجھے صاف صاف بتادیا گیا کہ اگر سپریم کورٹ۔ بھٹو صاحب کیلئے آزادی کا حکم بھی صادر کر دے کہ انہیں جیل سے نکال دیا جائے تو بھی ان کو جیل سے باہر ہرگز جانے نہیں دیا جائے گا۔ مجھے اس وقت صاف پتہ چل گیا تھا کہ بھٹو صاحب کو حکام کسی بھی حالت میں آزاد نہیں ہونے دیں گے اور انہیں ہر حالت

میں سزا ہوئی ہے جس کا مجھے بے حد ملال ہوا۔ صرف مارشل لاء جیسے نظام میں ایسا حکم صادر کیا جا سکتا ہے کہ اگر ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کسی مقدمے کا فیصلہ دے تو اس کو بھی نہ ماننے کا حکم دیا جا سکتا ہے! مجھے دوسرے ذرائع سے معلوم ہوا کہ ایک خاص ملٹری کورٹ بھی مقرر کر دیا گیا تھا تاکہ اگر سپریم کورٹ کا فیصلہ حسبِ منشا نہ ہوا تو اس کورٹ میں بھٹو صاحب کے مقدموں کی سماعت کی جائے گی۔

پنڈی جیل میں بھٹو صاحب کی اسیری کے دوران تو مجھ سے دوستوں، ساتھی افسروں اور ہر عہدہ کے سینئر افسروں نے ان کے متعلق کوئی خاص معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہ کی لیکن ان کے پھانسی لگ جانے کے بعد ہر ملنے والے نے اس موضوع پر بار بار پوچھا اور چونکہ بھٹو صاحب کے متعلق مختلف افواہیں گشت کر رہی تھیں اسلئے مجھ سے ہر خاص و عام نے حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ایسی ملاقاتوں کے دوران کئی ذمہ دار افسروں نے اس مقدمے کے کئی پہلو اور اصلی واقعات جو بالائی سطح پر ظہور پذیر ہوتے رہے ان کی خفیہ تفصیلات بھی مجھے بتائیں جو میرے لئے بے حد حیران کُن تھیں۔ اگر میں ان تفصیلات کو بھی قلمبند کر دوں تو ایک نئے تنازعے (Controversy) کا طوفان کھڑا ہو جائے گا۔ بہر حال اس کتاب میں، مَیں وہی کچھ لکھ رہا ہوں جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا۔ ویسے نواب محمد احمد خاں قصوری کے قتل کے متعلق، پنجاب ہائیکورٹ اور اس کے فیصلہ پر اثر اندازی کے متعلق، سلطانی گواہ اور دوسرے گواہوں کے بارے میں اور دیگر متعلقہ باتوں کے متعلق مجھے بے حد معتبر ذرائع سے بہت کچھ معلوم ہوا ہے جن پر میرے لئے کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن چونکہ ایسی باتیں سنی سنائی کے زمرے میں آتی ہیں اس لئے میں ایسے معتبر ذرائع سے بتائی ہوئی حقیقتوں کو ان صفحات پر کوئی جگہ نہیں دے رہا۔

موت کا پروانہ (Black Warrant) پنجاب ہائیکورٹ نے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو 18 مارچ 1978ء کو موت کی سزا سنائی تھی۔ اس فیصلے پر سپریم کورٹ آف پاکستان میں اپیل دائر کی گئی اور انہیں 17 مئی 1978ء کو لاہور سے پنڈی جیل منتقل کر دیا گیا۔ 6 فروری 1979ء کو سپریم کورٹ نے ان کی اپیل مسترد کر دی۔ پھر نظرِ ثانی اپیل بھی سپریم کورٹ نے 24 مارچ 1979ء کو مسترد کر دی۔ نواب محمد احمد خان قصوری کے قتل کیس میں مندرجہ ذیل پانچ مجرموں کی موت کا پروانہ (Black warrant) سنٹرل جیل راولپنڈی میں 30 مارچ 1979ء کو موصول ہوا۔

1۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو

2۔ میاں غلام عباس

3۔ صوفی غلام مصطفیٰ

4۔ رانا افتخار

5۔ مسٹر ارشد اقبال

چونکہ نظرِ ثانی کی اپیل کو خارج کرتے وقت اس دن (30-3-79) کو ابھی سات دن نہ

گزرے تھے اس لئے موت کا پروانہ حکومتِ پنجاب نے واپس منگوالیا تھا۔ (وہ وقت اگلے روز یعنی 31 مارچ 1979ء کو پورا ہوتا تھا)

گورنر پنجاب نے اس کیس میں مداخلت نہ کرتے ہوئے یکم اپریل 1979ء کو صبح دس بجے دستخط کر دیئے۔ صدرِ پاکستان نے بھی مداخلت نہ کرتے ہوئے اسی دن (یکم اپریل 1979ء) کو دستخط کر کے سزا کی توثیق کر دی تھی۔ حکومت نے فیصلہ کیا کہ مسٹر بھٹو کو باقی چار مجرموں سمیت 2 اپریل کی صبح 5 بجے پھانسی دیدی جائے۔ کسی وجہ سے اس فیصلے پر بھی نظر ثانی ہو گئی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ صرف بھٹو صاحب کو اکیلے پھانسی دی جائے اور باقی چار مجرموں کو ابھی یہ سزا نہ دی جائے۔ اس لئے بھٹو صاحب کی پھانسی کا وقت 2 اپریل کو ملتوی کر دیا گیا اور پانچ مجرموں کی موت کا مشترکہ پروانہ دوسری دفعہ بھی راولپنڈی جیل کے سپیشل کوریئر کے ذریعے لاہور واپس منگوا لیا گیا تاکہ اکیلے بھٹو صاحب کیلئے موت کا پروانہ تیار کیا جائے۔ مجھے بتایا گیا کہ چیف جسٹس پنجاب ہائیکورٹ مولوی مشتاق صاحب نے صرف بھٹو صاحب کی موت کے پروانہ پر دستخط کرنے پر نارضامندی ظاہر کی تھی، جس کے مطابق انہیں 3 اپریل رات دو بجے پھانسی لگانا تھی اور چیف جسٹس صاحب نے یہ کہا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ جیل اپنا اختیاری حق استعمال کرے اور مجرموں کو الگ الگ وقت میں پھانسی لگائے۔ مگر حکامِ بالا نے جب انہیں یہ یاد دلایا کہ یہ فیصلہ تو ان کا اپنا ہے اور اصلی مجرم ہی پہلے پھانسی لگایا جارہا ہے تو انہوں نے مجبوراً صرف بھٹو صاحب کے موت کے پروانے پر دستخط کئے۔ اس طرح صرف بھٹو صاحب کی موت کا پروانہ راولپنڈی جیل میں 2 اپریل کو ایک بجے بعد دوپہر وصول ہوا اور بھٹو صاحب کو تین اپریل 1979ء رات دو بجے پھانسی لگانے کی تمام کارروائی شروع کر دی گئی۔ بیگم نصرت بھٹو اور مس بے نظیر بھٹو کو آخری ملاقات کیلئے بلایا گیا (دراصل انہیں آخری ملاقات کا نہ بتایا گیا تھا بلکہ بھٹو صاحب سے ملنے جیل آنے کو کہا گیا تھا) مس بے نظیر بھٹو نے، جو سہالہ ریسٹ ہاؤس میں زیرِ حراست تھیں، یہ کہلا بھیجا کہ ان کی طبیعت ناساز ہے اس لئے وہ اس وقت (دو اپریل بعد دوپہر نہیں آسکتیں۔ اسی دوران ہوم سیکرٹری پنجاب ڈی ایم ایل اے کے دفتر سے ہوتے ہوئے پنڈی جیل سپرنٹنڈنٹ کے دفتر آئے اور میری موجودگی میں جیل سپرنٹنڈنٹ اور آئی جی جیل خانہ جات کو بتایا کہ قانون کے مطابق چونکہ صدر پاکستان کے دستخطوں کو 48 گھنٹے نہیں گزرے اس لئے بھٹو صاحب کو تین اپریل کی رات دو بجے پھانسی نہیں دی جاسکتی۔ یہ نکتہ حکومت پنجاب نے اٹھایا تھا، اس لئے بھٹو صاحب کی پھانسی ایک دن اور روک دی گئی۔ ادھر بیگم نصرت بھٹو اور مس بے نظیر بھٹو کو اطلاع دی گئی کہ اگر ان کی طبیعت ناساز ہے تو ان کے آنے کی ضرورت نہیں۔ ایس ایم ایل اے نے 2 اپریل کو مجھے اور جیل سپرنٹنڈنٹ کو مندرجہ ذیل احکامات جاری کئے تھے۔

1۔ بھٹو صاحب کو ان کی پھانسی کا آخری نوٹس راولپنڈی جیل سپرنٹنڈنٹ مسٹر یار محمد، لیفٹیننٹ کرنل رفیع الدین کی موجودگی میں ان کے سیل میں دیں گے۔ بعد میں تین اپریل دن کو بتایا گیا کہ نوٹس دیتے

وقت فرسٹ کلاس مجسٹریٹ بشیر احمد خان اور پنڈی جیل کے ڈاکٹر صغیر حسین شاہ بھی آخری نوٹس دیتے وقت سیل میں حاضر ہوں گے۔

مجھے الگ بتایا گیا کہ

2۔ بھٹو صاحب کو آخری نوٹس جاری کرنے کے بعد ان کو پھانسی لگنے تک ان کے تاثرات اور ان کی بات چیت ریکارڈ کرنا ہو گی۔ (اس کام کیلئے میں نے صوبیدار عجائب خان 27 پنجاب رجمنٹ کو مقرر کیا)

3۔ آخری نوٹس کے فوراً بعد اپنا ایک فوجی بھٹو صاحب کے سیل پر تعینات کر دیں جو پھانسی لگنے تک ڈائری ریکارڈ کرے گا۔ (صوبیدار عجائب خان)

4۔ آخری نوٹس پر فوجی گارد بھی جیل گارد کے اوپر سیکورٹی سیل پر (Super Impose) کر دی جائے گی۔

5۔ جیل کے ٹیلیفون:۔ سورج غروب ہوتے ہی جیل کے تمام ٹیلیفون کاٹ دیئے جائیں تاکہ جیل کا رابطہ باہر کی دنیا سے منقطع کر دیا جائے۔ صرف فوجی ٹیلیفون جو صرف ایک افسر سنے گا کام کرتا رہے گا اس کے علاوہ خاص وائرلیس سیٹ بھی کام کرتا رہے گا۔

6۔ سورج غروب ہونے پر جیل کا صدر دروازہ فوجی گارد کے تحت کام کرے گا جو 4 اپریل کی صبح تک اس کنٹرول پر مامور رہے گی۔

7۔ فائنل نوٹس کے بعد کوئی شخص 4 اپریل کی صبح تک جیل میں نہ داخل ہو سکے گا اور نہ باہر جا سکے گا۔

8۔ صوبیدار میجر 27 پنجاب خاموشی سے تابوت ' پھول ' گلاب کا عرق اور سینٹ وغیرہ کا بندوبست کرے گا۔

9۔ دو گاڑیاں ' ایک بھٹو صاحب کی لاش کیلئے اور دوسری گارڈ کیلئے ' پھانسی لگ جانے کے بعد ' حکم ملنے پر جیل میں داخل ہوں گی۔ تین ہتھیاروں کے خالی بکس بھی ' جو تابوت سے مشابہ ہوں گے ' ان گاڑیوں میں رکھے جائیں گے تاکہ ایئر بیس پر دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہو کہ فوجی کہیں ہتھیار لے جا رہے ہیں۔

10۔ ایک فیلڈ افسر کے ماتحت ایک سیکشن پوری فوجی تیاری کے ساتھ بھٹو صاحب کی لاش کے ساتھ جائے گی۔ لیفٹیننٹ کرنل رفیع ' بھٹو صاحب کی میت کے ساتھ پنڈی سے نوڈیرو جائیں گے ' جہاں قبر اور تدفین کا بندوبست تیار ہو گا۔

11۔ لیفٹیننٹ کرنل رفیع کے ساتھ ایک وائرلیس سیٹ رہے گا اور بھٹو صاحب کی پھانسی پر وہ

ایس ایم ایل اے کو، جن کا ہیڈ کوارٹر جیل سے باہر ایس ایس پی کے دفتر میں ہو گا' کوڈ ورڈ بلیک ہارس (Black Horse) سے اطلاع دیں گے۔

12۔ بھٹو صاحب کی لاش کو غسل دینے کیلئے 27 پنجاب ایک آدمی کا بندوبست کریگی (یہ کام بعد ازاں تین اپریل کو ایس ایس پی راولپنڈی کو سونپ دیا گیا تھا)

13۔ ایک فوٹو گرافر' جو ایک انٹیلی جنس ایجنسی سے تھا' اپنے سامان کے ساتھ تین اپریل شام پانچ بجے جیل میں رپورٹ کرے گا۔ وہ بھٹو صاحب کی لاش کے فوٹو لے گا (تاکہ معلوم ہو سکے کہ ان کے ختنے ہوئے تھے یا نہیں؟) (مجھے سرکاری طور پر بتایا گیا تھا کہ مسٹر بھٹو کی ماں ہندو عورت تھی جو ان کے والد نے زبردستی اپنالی تھی اور مسٹر بھٹو کا پیدائشی نام نتھارام تھا اور غالباً ان کے ختنے نہیں کرائے گئے تھے) پھانسی اور غسل کے بعد اس فوٹو گرافر نے بھٹو صاحب کے جسم کے درمیانی حصے کے نزدیکی فوٹو لئے تھے۔ پڑھنے والوں کیلئے میں بتا دوں کہ بھٹو صاحب کا اسلامی طریقے سے باقاعدہ ختنہ ہوا ہوا تھا۔

14۔ مجھے یہ بھی حکم دیا گیا کہ تین اپریل صبح گیارہ بجے یقین کر لیا جائے کہ جلاد 'تارہ مسیح پنڈی جیل میں موجود ہے اور اسے پنڈی جیل کے ایک کمرہ میں مقفل کر دیا جائے۔ یہ کام جیل سپرنٹنڈنٹ نے سرانجام دیا تھا۔

بھٹو صاحب سے ملنے پر پابندی:۔ 6 فروری 1979ء کو سپریم کورٹ نے بھٹو صاحب کی اپیل مسترد کر دی تھی۔ اس دن سے بھٹو صاحب کے بارے میں جیل سٹاف کا رویہ بدلنے لگا تھا۔ جب رحم کی اپیل بھی مسترد کر دی گئی تو ہر شخص کا رویہ بالکل بدل گیا۔ اس کے بعد میں جب بھی بھٹو صاحب سے ملا' انہوں نے یہی گلہ کیا کہ ان کی بے عزتی ہو رہی ہے۔ اور عام وارڈر بھی ذرہ برابر پروا نہیں کرتا۔ میں نے کوشش کی کہ جیل حکام اتنی سختی نہ کریں لیکن سب نے آنکھیں پھیر لی تھیں۔ میں نے اشارتاً بھٹو صاحب کو بتانے کی کوشش کی لیکن وہ ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے کہ یہ ان کی عزت کا معاملہ ہے۔ وہ جواب میں کہا کرتے تھے کہ ان کے متعلق فیصلہ جو بھی ہو' کم از کم جیل سٹاف تو ان سے اس طرح کا برتاؤ نہ کرے۔ مارچ 1979ء کے مہینے میں انہوں نے سیل سے باہر نکلنا بھی کم کر دیا تھا۔ مارچ کے چوتھے ہفتے میں مجھے اور چودھری یار محمد کو ایس ایم ایل اے نے اپنے صدر دفتر بلایا جہاں سپرنٹنڈنٹ جیل نے انہیں علیحدگی میں بتایا کہ نہ معلوم کرنل رفیع بھٹو صاحب کے ساتھ کیا باتیں کرتا رہتا ہے اور نہیں معلوم ان کے درمیان کیا کھچڑی پک رہی ہے کیونکہ کرنل رات کئی کئی گھنٹے ان کے سیل میں ان کے پاس رہتا ہے اور عموماً بعد دوپہر بھی ان سے باہر صحن میں ملاقاتیں کرتا ہے۔ ایس ایم ایل اے نے مجھ سے پوچھا تو میں نے انہیں بتایا کہ چونکہ بھٹو صاحب میری راست نگرانی میں ہیں اور جب میں ان کے پاس ہوتا ہوں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ذمہ داری بہت احسن طریقے سے پوری کی جا رہی ہے۔ دراصل ایس ایم ایل اے صاحب کو میرے بھٹو صاحب کے ساتھ اتنا وقت گزارنے کی خبر ہی نہ تھی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ کرنل رفیع آپ کو کس نے

حکم دیا کہ آپ بھٹو صاحب کے ساتھ ملا کریں۔ میں نے انہیں بتایا کہ گذشتہ ایس ایم ایل اے (بریگیڈیئر ایم ممتاز ملک) نے مجھے کہا کہ میں کبھی کبھار اندر جا کر بھٹو صاحب کو ضرور دیکھا کروں اور اس دن سے میں بھٹو صاحب سے ہمیشہ ملتا رہا ہوں' وہ حیران ہو گئے۔ 6 فروری کے واقعہ (جب میں نے بیگم بھٹو صاحبہ کو جیل کے اندر آنے کی اجازت دی تھی) کے بعد مجھ پر انہیں کچھ شک تو ہو ہی گیا تھا انہوں نے اسی وقت مجھے اور جیل سپرنٹنڈنٹ کو سختی سے منع کر دیا کہ ہم دونوں میں سے کوئی بھی بھٹو صاحب سے اکیلا نہیں مل سکتا اور اگر ضرورت ہوئی تو ان کے حکم پر ہم دونوں اکٹھے جا کر بھٹو صاحب سے ملیں گے اور ضروری کارروائی کے بعد سیکورٹی وارڈ سے باہر آ جائیں گے۔ اس دن سے میرا اکیلے بھٹو صاحب کے سیل میں جانا بند ہو گیا۔ مجھے اس حکم پر افسوس ہوا کیونکہ جیل حکام کا یہ خیال تھا کہ میں شاید مارشل لاء حکومت کا خاص الخاص نمائندہ تھا جو تقریباً سال بھر بھٹو صاحب کے ساتھ کھلا ملتا رہا۔ مجھے افسوس اس بات پر ہوا کہ میں بھٹو صاحب کے آخری چند دنوں میں ان سے اکیلا نہ مل سکا اور شاید وہ یہ سوچتے ہوں گے کہ میں بھی دوسروں کی طرح خود غرض ہی نکلا۔ بہرحال ہفتہ بھر میں ان کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا اور یوں میری یہ تاریخی ڈیوٹی جیل کے اندر ختم ہو گئی۔

مقدمے کے ساتھی قیدی۔ نواب محمد احمد خاں قصوری کے قتل کے مقدمے میں بھٹو صاحب کو پنڈی جیل منتقل کرنے کے چند روز بعد ان کے مندرجہ ذیل ساتھی قیدیوں کو بھی راولپنڈی جیل میں لایا گیا اور وہیں قید رکھا گیا

ا۔ میاں غلام عباس — سابقہ ڈائریکٹر جنرل فیڈرل سیکورٹی فورس

ب۔ صوفی غلام مصطفیٰ
ج۔ رانا افتخار
د۔ ارشد اقبال
} ان سب کا تعلق فیڈرل سیکورٹی فورس سے تھا

ان قیدیوں کو سیکورٹی وارڈ سے ملحق جنوب کی جانب مگر کچھ فاصلے پر قیدیوں کی ایک بیرک میں الگ الگ کوٹھڑیوں میں رکھا گیا تھا۔ یہ بیرک بھی باقی جیل کی طرح سیکورٹی وارڈ سے کانٹے دار تاروں وغیرہ کے ذریعے الگ کر دی گئی تھی۔ میاں غلام عباس ایک پرانے پولیس افسر تھے۔ انہوں نے اس مقدمے میں مسٹر قربان صادق اکرام کو اپنا وکیل مقرر کیا ہوا تھا۔ میاں عباس دل کے مریض تھے۔ وہ کافی کمزور حالت میں تھے اور ہر روز دل کی بیماری کی دوائیں کھایا کرتے تھے۔ میں نے ان کو ایک خاموش اور حلیم طبع انسان پایا۔ میرا خیال تھا کہ اگر سپریم کورٹ کا آخری فیصلہ ان کو پھانسی لگانے کا ہوا تو وہ شاید اسے برداشت نہ کر سکیں۔ بھٹو صاحب کی پھانسی کے بعد جب ان قیدیوں کو بھی کچھ دنوں بعد پھانسی دیدی گئی تو ایک دن میرے جیل کے چکر لگانے پر جیل حکام نے بتایا کہ میاں غلام عباس جسمانی کمزوری اور دل کی بیماری کے باوجود پھانسی لگتے وقت بڑے حوصلے میں تھے۔ پھانسی کا پھندا ان کے گلے میں ڈلنے سے پہلے انہوں نے پوچھا کہ

مجھے کہاں کھڑا ہونا ہے۔ پھٹے پر کھڑے ہو کر انہوں نے کلمۂ شہادت پڑھا۔ اسیری کے دوران وہ باقاعدگی سے نماز پڑھتے رہے اور ان کا برتاؤ بڑا اچھا تھا۔

صوفی غلام مصطفیٰ سپیشل سروس گروپ کے ایک جوان تھے، جنہوں نے میرے ہوتے ہوئے چراٹ میں سروس کی تھی۔ جب میں ان قیدیوں کی بیرک میں پہلی دفعہ معائنہ کیلئے بھیجا گیا تو صوفی غلام مصطفیٰ نے مجھے دُور سے پہچان لیا اور میرا نام لے کر مجھے خوش آمدید کہا اور پھر پوچھا کہ میں وہاں کیسے آیا ہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں فوج سے تبدیل ہو کر جیل خانہ جات میں آگیا ہوں اور سپیشل سیکورٹی سپرنٹنڈنٹ کا کام کر رہا ہوں۔ وہ اپنے انداز میں مسکرایا اور بولا جناب ایک ایس ایس جی کا میجر تو آج کل لیفٹیننٹ کرنل ہونا چاہئے جیل کے محکمہ میں اس پوسٹ پر! پھر کہنے لگا آپ کی کورا تنی اچھی نہیں جتنی کہ امریکن ہمیں سکھلائی کے دوران پڑھا گئے تھے۔ صوفی مصطفیٰ کی جسمانی حالت اتنی اچھی نہیں تھی۔ وہ مثانہ کی بیماری میں مبتلا تھا اور اسے بار بار باتھ روم جانا پڑتا تھا۔ سپریم کورٹ میں اپیل کے دوران بھی اسے یہ پرابلم تھا۔ وہ جسمانی لحاظ سے کافی کمزور ہو چکا تھا لیکن دماغی طور پر بہت ہوشیار تھا۔

مسٹر ارشد احمد قریشی کو صوفی غلام مصطفیٰ، رانا افتخار اور ارشد اقبال نے مشترکہ وکیل کیا ہوا تھا۔ میں جب کبھی اس بیرک میں جاتا تو غلام مصطفیٰ سے ضرور ملتا۔ ہم ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح تو نہیں جانتے تھے کیونکہ وہ میری کمپنی میں نہ تھا بلکہ ابراہیم کمپنی میں تھا لیکن ایس ایس جی کے ناطے ہمارا رشتہ ضرور تھا۔ ایک دن میں نے صوفی غلام مصطفیٰ سے پوچھا کہ وہ قتل کے کیس میں کہاں تک ملوث تھا۔ کہنے لگا مجھے بھٹو صاحب کی شمولیت کا بالکل علم نہیں۔ ہمیں کہا گیا کہ ان کی شمولیت سے ہم بچ جائیں گے۔ اس نے مجھے بتایا کہ محکمہ کے افسرانِ اعلیٰ کے حکم پر اس نے ہتھیار اور ایمونیشن قاتلوں کو دیا تھا تاکہ مسٹر قصوری کو قتل کر دیا جائے لیکن فائرنگ کے دوران ان کے والد نواب محمد احمد خان مارے گئے۔ مجھے اس نے بتایا کہ وہ اس کیس میں بے گناہ ہے کیونکہ بالا حکام کے حکم پر اس نے ہتھیار اور بارود کوت سے دیا تھا۔ بہر حال کہنے لگا کہ اسے پتہ ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ کیوں سزا دے رہا ہے کیونکہ اس نے بالا افسروں کے احکامات پر بہت سے بے گناہ، صالح اور خدا پرست لوگوں پر ظلم ڈھائے تھے جن کا اسے افسوس ہے اور اس کا ضمیر اسے بے حد لعنت ملامت کرتا رہتا ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں میں ایک خاص معنی خیز حالت لاتے ہوئے مجھے دھیمی آواز میں بتایا کہ اسے قول دیا گیا ہے کہ وہ اس کیس میں بچا لیا جائے گا۔

بعد میں جیل حکام نے مجھے بتایا کہ صوفی غلام مصطفیٰ پھانسی کے پھندے تک بڑی دلیری اور بہادری سے گیا۔ وہ آخیر تک مسکراتا رہا اور کلمۂ طیبہ و درود شریف پڑھتا رہا۔

رانا افتخار اور ارشد اقبال بھی اسی مقدمے میں ساتھی قیدی تھے۔ یہ دونوں قدرے کم عمر ہونے کی وجہ سے جسمانی لحاظ سے بہت چست و چالاک تھے۔ پہلے دن ہی ان کو دیکھنے کے بعد میں نے جیل سپرنٹنڈنٹ کو بتایا کہ یہ کافی خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں اور ان دونوں کو اکٹھا ٹہلائی کیلئے کوٹھڑیوں سے باہر نہ نکالا جائے۔ وہ دونوں اس قابل تھے کہ سنتری سے رائفل چھین لیں اور کوئی ناخوشگوار واقعہ کر بیٹھیں۔ علاوہ

ازیں وہ دونوں اس قدر چست اور پھرتیلے تھے کہ مل کر جیل کی دیوار کو، جس پر بعد میں کانٹے دار تار لگا دی گئی تھی، پھلانگ سکنے کے قابل تھے۔ اس دن سے ان قیدیوں کی ٹہلائی کے وقت اوپر والی پوسٹ پر ایک سنتری خاص کر ان پر نظر رکھنے کیلئے مقرر کر دیا گیا۔ چند ماہ بعد ان میں سے ایک اپنی التجا پر فیصل آباد جیل منتقل کر دیا گیا۔ جہاں اسے پھانسی دیدی گئی۔

کور کمانڈر کی تشویش:۔ آخیر جون یا اوائل جولائی میں ایس ایم ایل اے ' نے مجھے بلایا اور کہا کہ کور کمانڈر صاحب کافی متفکر ہیں کہ کہیں ساتھی قیدی (Co-Prisoners) ہائیکورٹ میں بھٹو صاحب کے خلاف دیئے ہوئے بیانات سے منحرف نہ ہو جائیں۔ انہوں نے مجھے کہا کہ جنرل صاحب چاہتے ہیں کہ میں ان سے جیل میں ملوں اور ان کے خیالات معلوم کروں اور ان کی ڈھارس بندھواؤں کہ وہ اپنے بیانوں پر ثابت قدم رہیں اور ان کو یقین دلاؤں کہ اگر وہ اپنی دی ہوئی گواہی پر مستقل رہے تو ان کو پھانسی ہرگز نہیں لگایا جائے گا۔ اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی کہا گیا کہ کور کمانڈر صاحب چاہتے ہیں کہ ان کا خاص خیال رکھا جائے تاکہ ان کو کوئی تکلیف نہ ہو۔

میں نے ایس ایم ایل اے صاحب کو بتایا کہ چونکہ وہ سیکورٹی وارڈ میں نہیں ہیں اس لئے میں ان کی کسی طریقے سے دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔ میں نے اس معاملے میں جیل حکام سے کبھی کسی قسم کی بات نہیں کی تھی، پھر میں ان کے ساتھ کس اتھارٹی سے بات چیت کر کے ان کو یقین دہانی کرا سکتا تھا کہ ان کی جان بخشی ہوگی، بشرطیکہ وہ اپنی دی ہوئی گواہی سے نہ پھریں۔ میں نے انہیں لارنس آف عریبیا کا قصہ سنایا کہ اس نے عربوں کے ساتھ پہلی جنگِ عظیم میں کتنے وعدے کئے تھے۔ لیکن جنگ کے بعد انگریزوں نے ان میں سے ایک وعدہ بھی پورا نہ کیا اور لارنس آخر کار ایک گمنام موت مرا۔ جس شخص نے اتحادیوں کے لئے پوری جنگ کا پانسا پلٹ دیا تھا اس کے ساتھ کئے گئے وعدے اور یقین دہانیاں کہاں گئیں؟ چونکہ بریگیڈیئر ممتاز ملک ایک نیک دل انسان تھے، انہوں نے مجھ پر زور نہ دیا اور پھر یہی کہا کہ میاں کم از کم ان کے خیالات اور مورال کا معلوم کر کے بتا دیجئے تاکہ کور کمانڈر صاحب کو کچھ تو بتایا جائے۔ یوں میرے اوپر وہ راز کھلتے گئے جو گہرائیوں میں پنہاں تھے۔

جب بھٹو صاحب کو اکیلا پھانسی لگانے کا حکم آیا اور ان کے ساتھی قیدیوں کے اکٹھے بلیک وارنٹ کو تبدیل کر دیا گیا تو مجھے اس ملک میں انصاف کرنے والوں پر بے حد افسوس ہوا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ رفیع تم نے تو اپنے ضمیر کو خوش کر دیا تھا کہ میں کیوں غلط وعدہ کروں لیکن اس ملک میں حکومت کے پاس اپنے کام کروانے کے بے شمار ذرائع ہوتے ہیں۔ بہر حال میری یونٹ کے افسروں کو ساتھی قیدیوں کے پھانسی نہ لگنے پر بہت افسوس ہوا اور انہوں نے اپنے خیالات مجھ تک پہنچائے جس پر میں نے حکام بالا کو لکھا لیکن کچھ دنوں بعد عقل کی فتح ہوئی اور تمام قیدی سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق اپنے انجام کو پہنچے۔

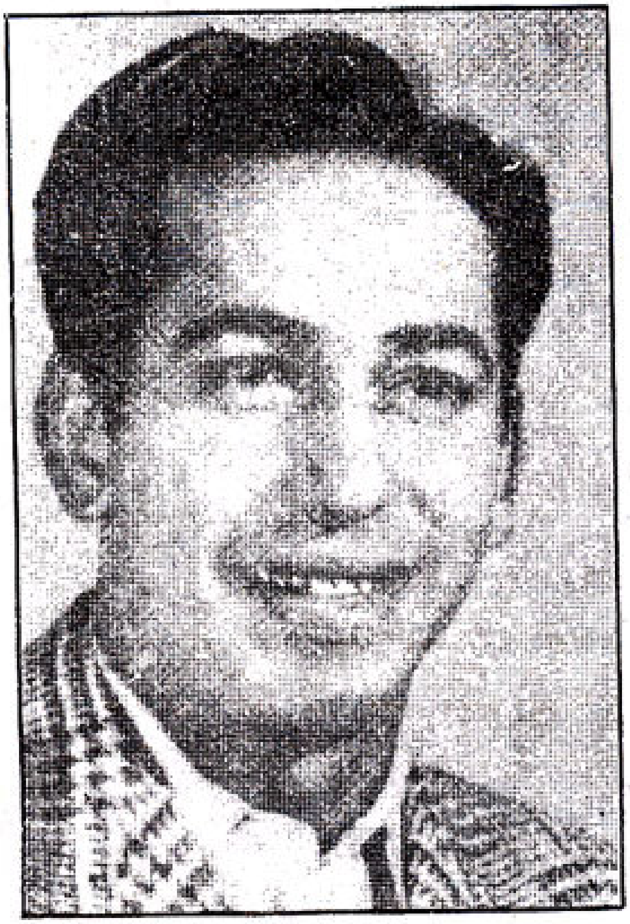

مستقبل کے خوابوں کا سفر

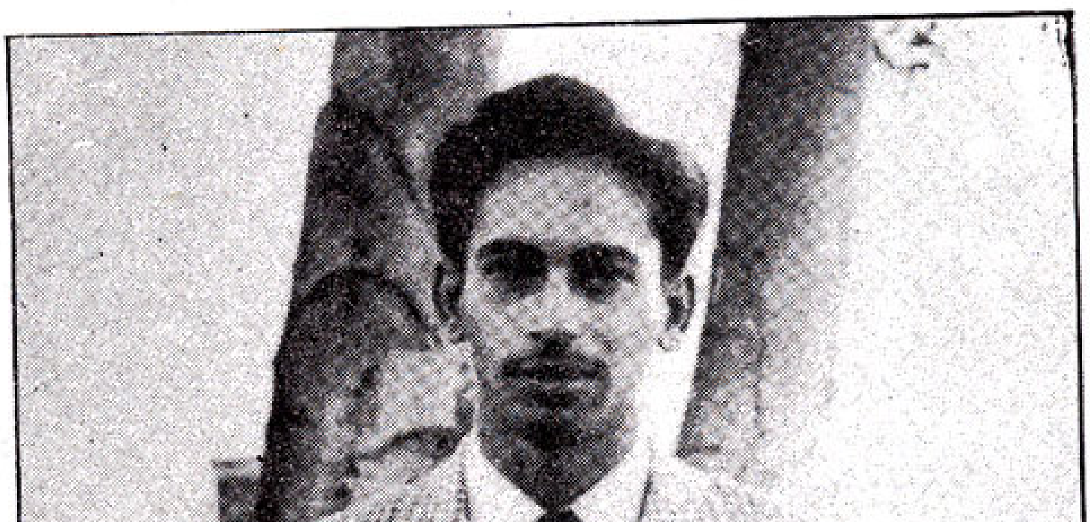

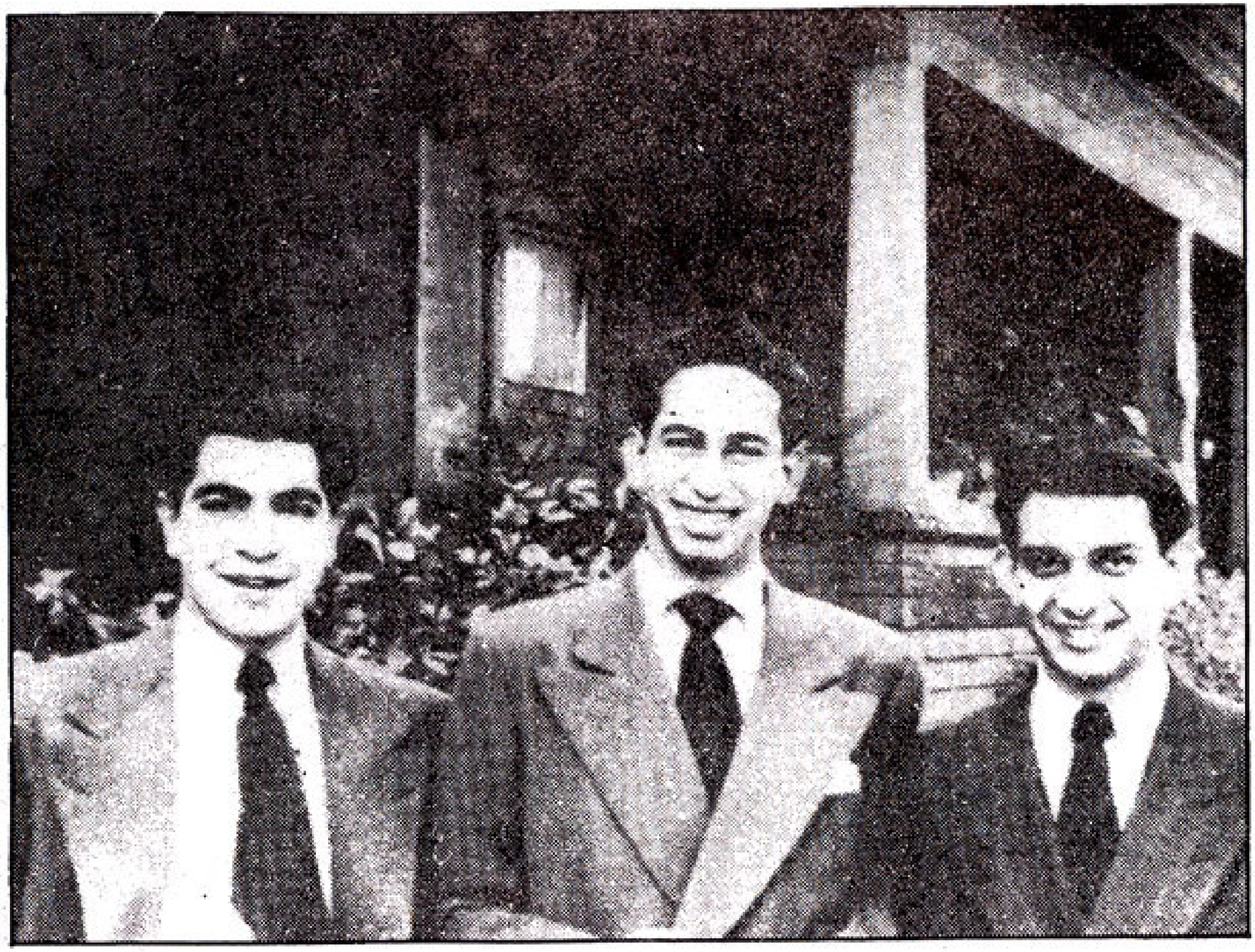

بے ساختہ ہنسی کے آزاد دن لاس اینجلس میں' 1947ء

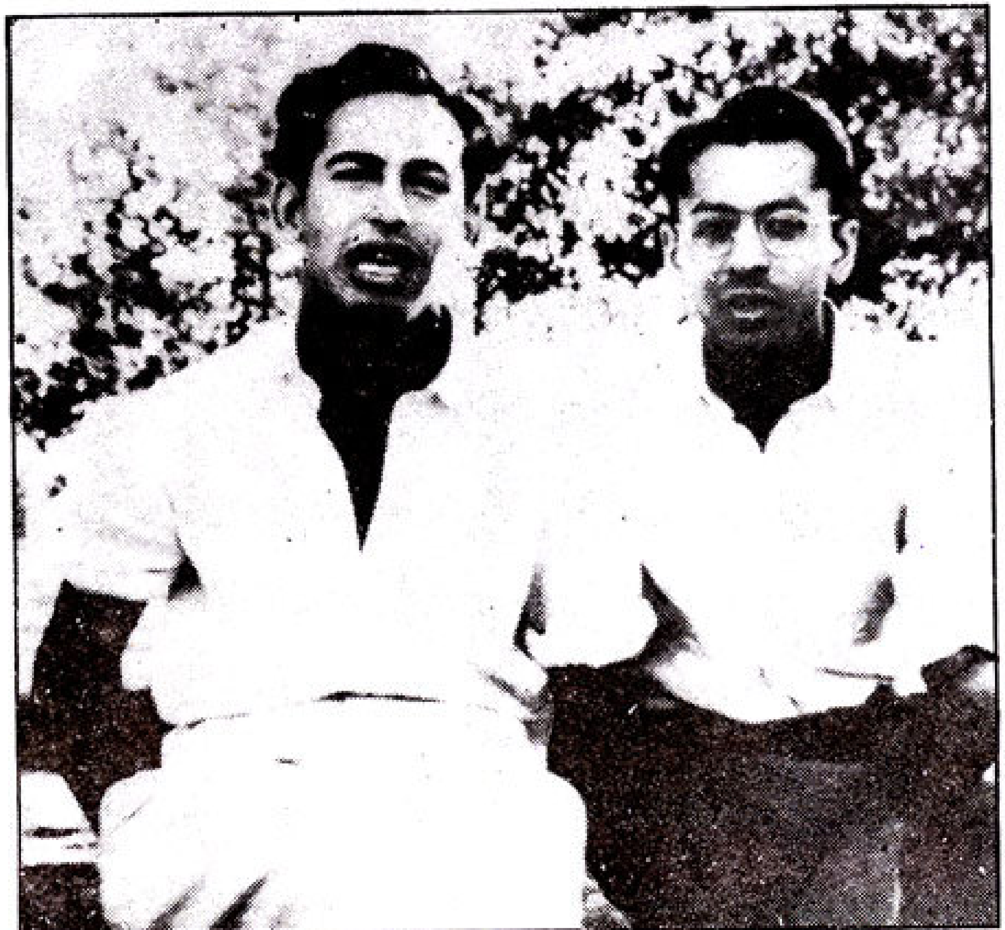

طالب علمی کے دور کی رفاقتیں ○ بیورلے ہلز میں دوستوں کے ساتھ

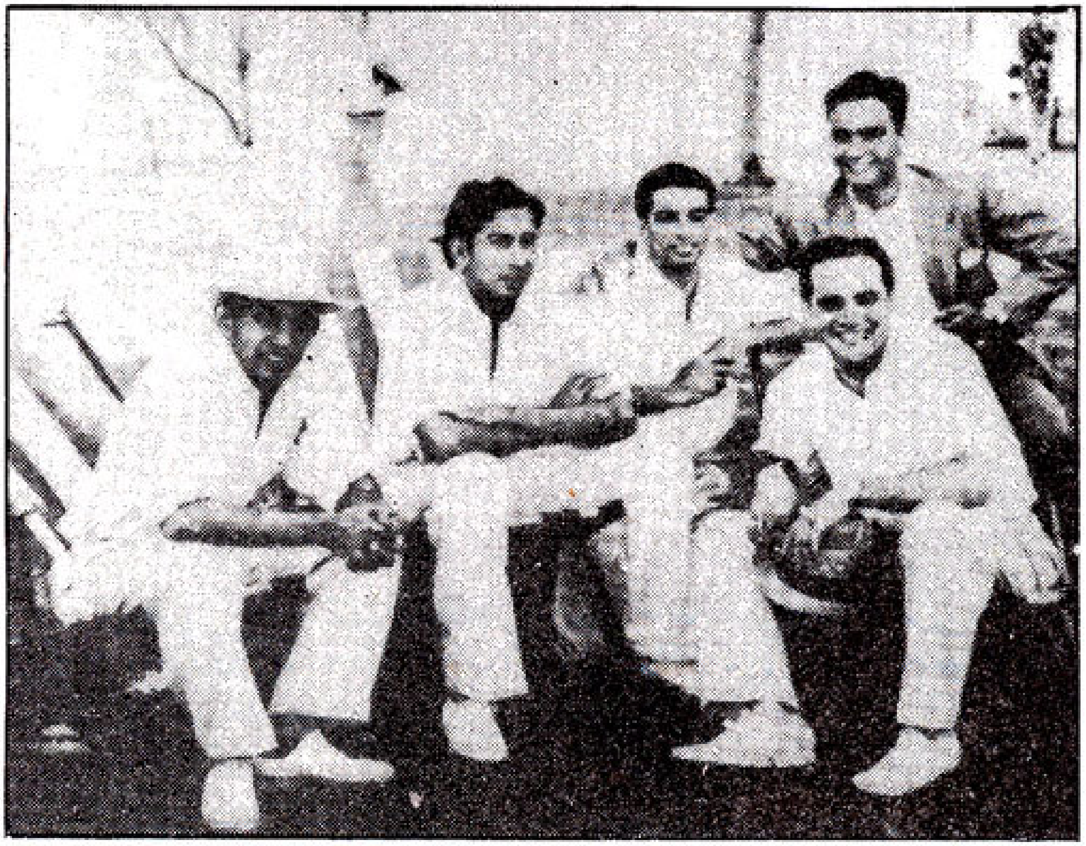

نوعمری، طالب علمی اور شگفتگی کا دور، بمبئی 1945ء

ایوب کے ایوانِ اقتدار میں

بھارتی وزیراعظم جواہر لعل نہرو کے ساتھ

○ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے 15ویں سیشن کی صدارت کرتے ہوئے (سیکرٹری جنرل ڈیگ ہیمرز کولڈ بھی نظر آرہے ہیں)

حلفِ وفاداری...... یا عوام سے وفاداری میں جان دے دینے کا عہد

20 ستمبر 71ء ..... یحییٰ خان سے صدر اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہوئے (موجودہ صدر اسحاق خان بھی نظر آ رہے ہیں)

امن آزادی اور جمہوریت کیلئے جدوجہد کی طرف

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ..... آئین 73ء پر دستخط

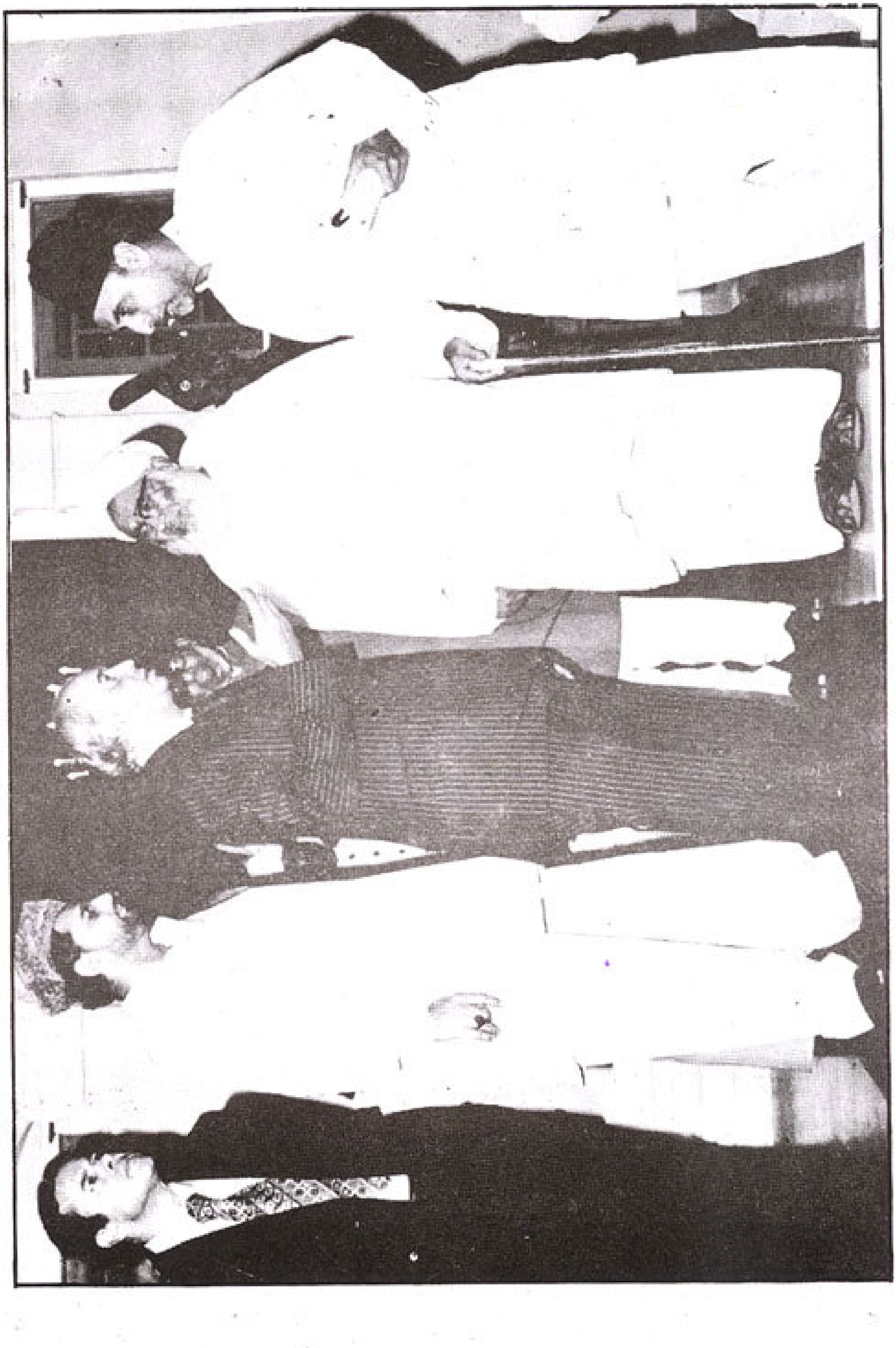

1977ء مذاکرات کی میز پر

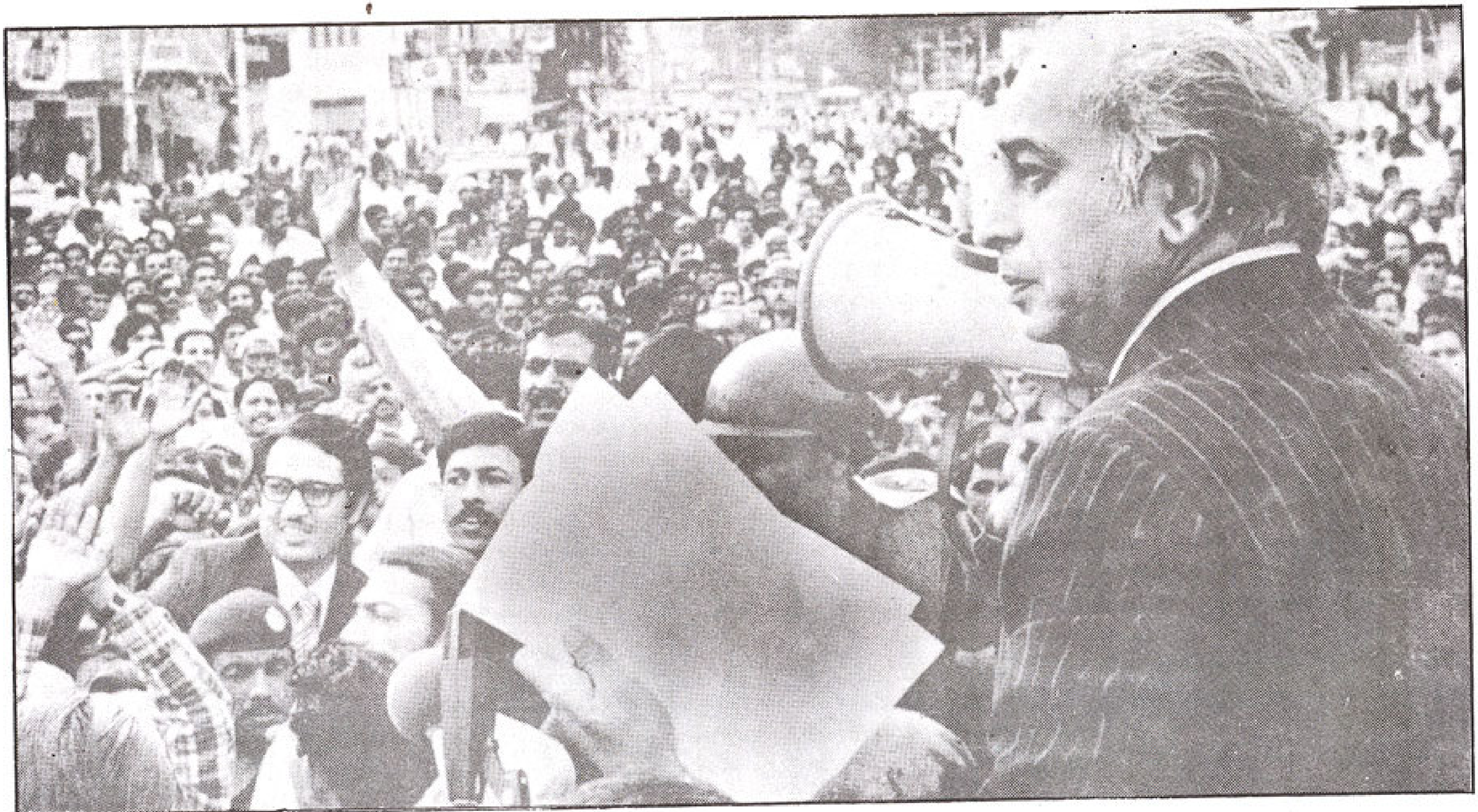

ہنری کسنجر کا خط......اور آخری جلسہ سے خطاب

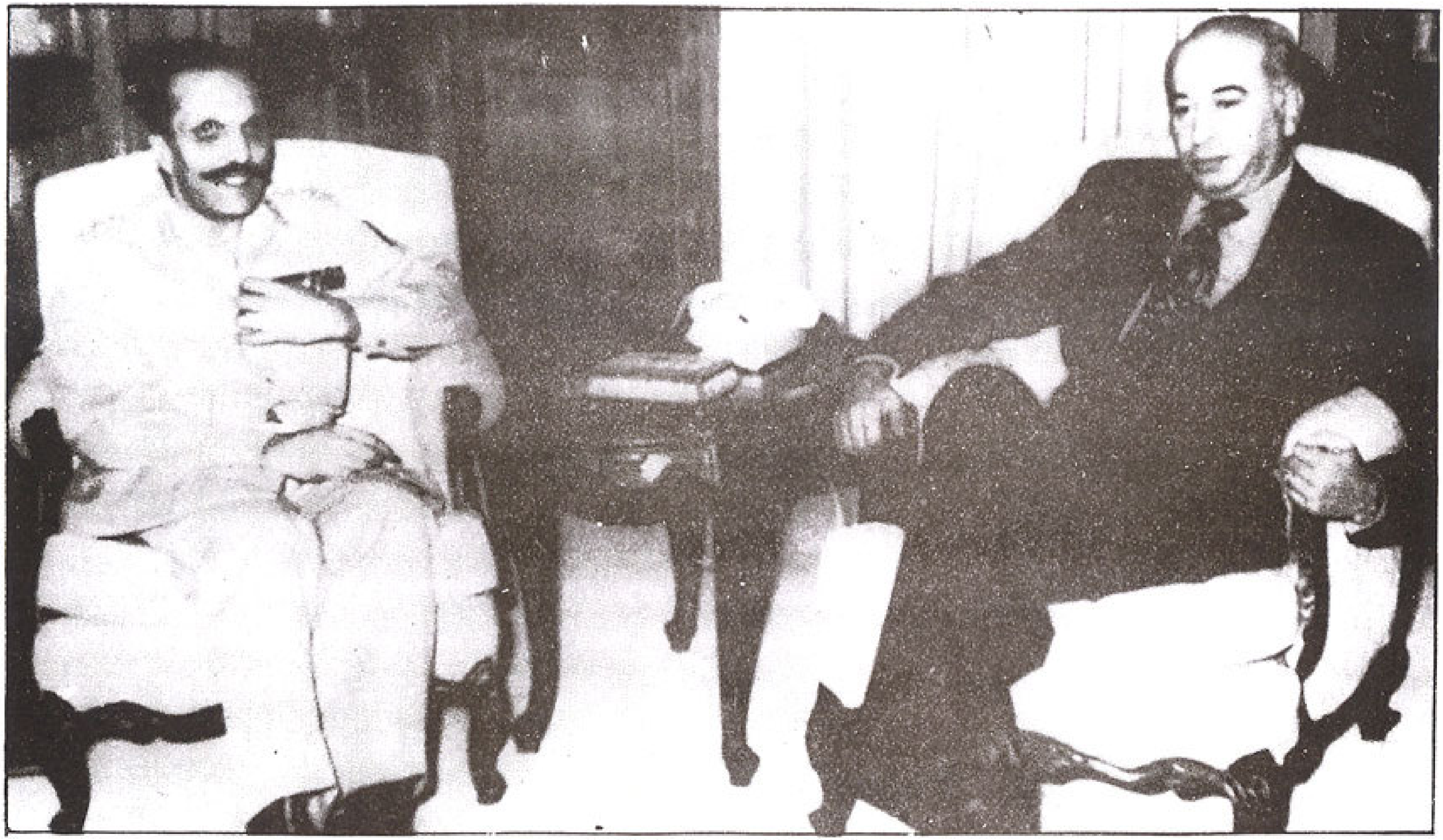

گرفتاری کے بعد مری ریسٹ ہاؤس میں

لاہور ہائی کورٹ میں مقدمے کی کارروائی

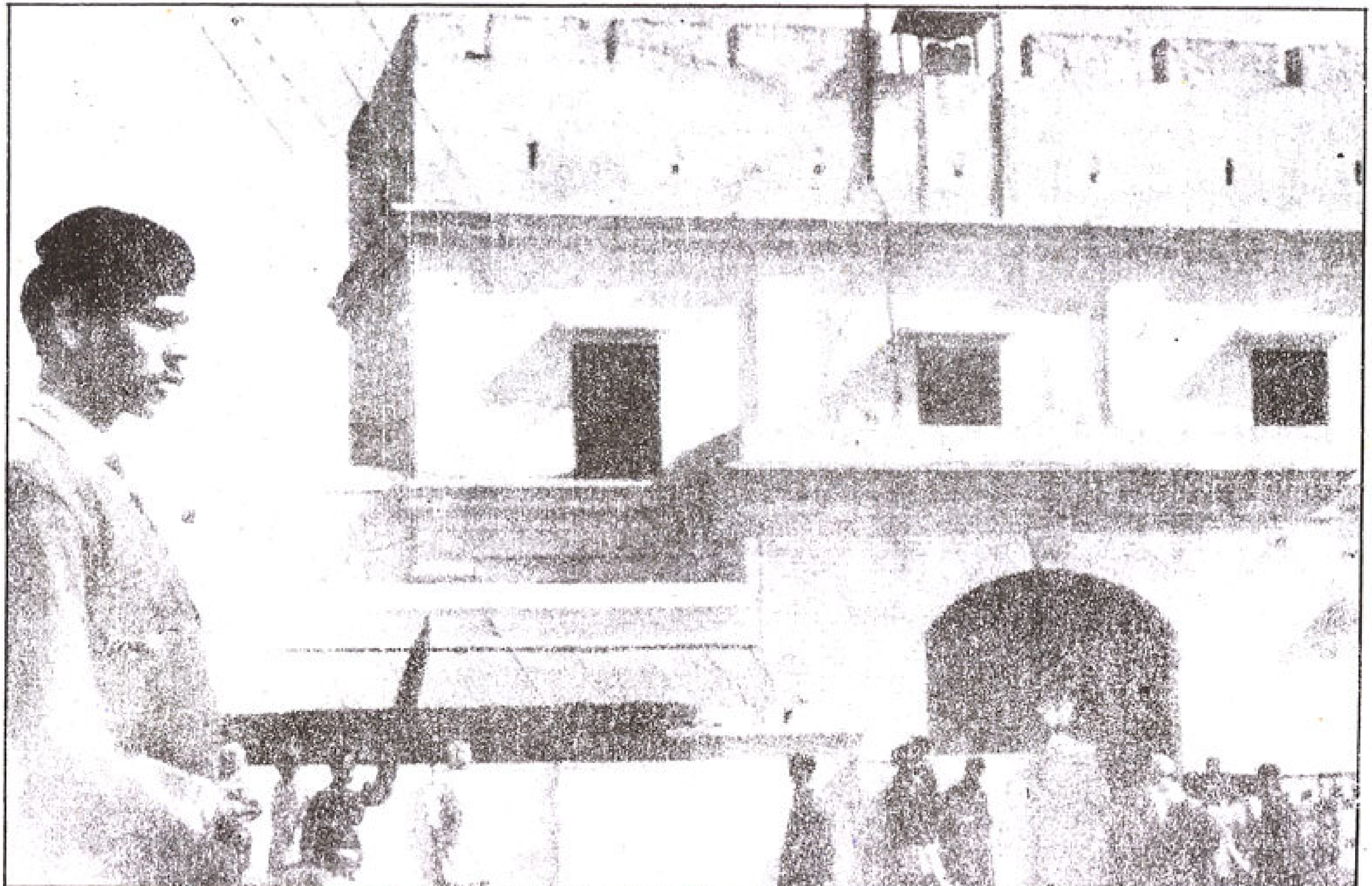

راولپنڈی سنٹرل جیل جہاں بھٹو کو پھانسی دی گئی

آخری لمحات

آخر کار حکام نے دو اپریل 1979ء کی شام آخری فیصلہ کیا کہ بھٹو صاحب کو 3 اور 4 اپریل 1979ء کی درمیانی رات دو بجے پھانسی دیدی جائے۔ جیل کی کتاب قوانین (Jail manual) کے مطابق پھانسی کا وقت صبح سویرے ہوتا ہے' لیکن حکومت نے بھٹو صاحب کی پھانسی کا وقت رات کو مقرر کیا۔ جس کی وجہ مجھے معلوم نہ ہو سکی۔ جیل کے قوانین کی اسی کتاب کے مطابق پھانسی پانے والے کے رشتہ داروں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ وہ اس سے آخری ملاقات وقت مقررہ کے مطابق جیل میں کر لیں۔ بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو سہالہ ریسٹ ہاؤس میں احتیاطی نظر بندی کے قانون کے تحت قید تھیں۔ بھٹو صاحب کے چند نزدیکی رشتہ دار بھی ان دنوں پنڈی میں موجود تھے۔ بھٹو صاحب کے ان تمام رشتہ داروں کو تین اپریل 1979ء کو ان سے جیل میں آخری ملاقات کرنا تھی۔ جس کا بندوبست کر لیا گیا تھا۔

بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کی بھٹو صاحب کے ساتھ آخری ملاقات!

بھٹو صاحب کی پھانسی کا آخری فیصلہ ہو جانے پر تین اپریل 1979ء صبح سویرے بھٹو خواتین کو سہالہ ریسٹ ہاؤس میں ملاقات کی اطلاع کر دی گئی تھی۔ ان کو لانے والی گاڑی جیل میں صبح گیارہ بج کر پندرہ منٹ پر داخل ہوئی۔ جیل سپرنٹنڈنٹ انھیں گیٹ سے سیکورٹی وارڈ تک لے گیا' اس دوران انہوں نے چودھری یار محمد سے پوچھا کہ یہ ملاقات کس سلسلے میں ہے اس نے انھیں بتایا کہ یہ آخری ملاقات ہے۔

بیگم بھٹو اور محترمہ بے نظیر نے بھٹو صاحب کے ساتھ ملاقات ساڑھے گیارہ بجے شروع کی۔

مجھے بتایا گیا کہ قانون کے مطابق بھٹو صاحب سیل کے اندر رہے اور باہر سے لوہے والے جنگلے پر تالا لگا رہا۔ بیگم نصرت بھٹو کیلئے سیل کے دروازے کے ساتھ باہر کرسی لگا دی گئی جبکہ محترمہ بے نظیر بھٹو سیل کے جنگلے کے باہر دالان کے فرش پر بیٹھ گئیں اور باپ بیٹی کے درمیان سیل کے آہنی گیٹ کی سلاخیں حائل رہیں۔ یہ ملاقات بعد دوپہر دو بجے تک جاری رہی۔ ملاقات شروع ہونے کے چند لمحوں بعد بھٹو صاحب نے جیل سپرنٹنڈنٹ کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا کہ کیا یہ آخری ملاقات ہے؟ جس کا اس نے ہاں میں جواب دیا۔ بھٹو صاحب نے پھر پوچھا کہ ان کے باقی رشتہ داروں کی ملاقات کا کیا ہو گا۔ چودھری یار محمد نے انہیں بتایا کہ خواتین کی ملاقات کے بعد ان کو ان سے ملا دیا جائے گا۔ بھٹو صاحب نے مس بے نظیر کو ایک طرف ہونے کو کہا اور جیل سپرنٹنڈنٹ کو اشارے سے اپنے بالکل نزدیک بلایا اور پوچھا کہ واقعی یہ آخری ملاقات ہے۔ انہوں نے جواب میں بتایا کہ ہاں یہ درست ہے۔ پھر مسٹر بھٹو نے پوچھا کہ آخری فیصلے کا کیا ہوا۔ اس پر یار محمد نے جواب دیا کہ وہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ پھر بھٹو صاحب نے پوچھا کہ کس وقت؟ انہوں نے جواب دیا' معمول کے مطابق یعنی صبح ساڑھے پانچ بجے۔ واپسی پر جیل سپرنٹنڈنٹ نے مجھے بتایا کہ بھٹو صاحب نے ہاتھ کے اشارے کے ساتھ کہا کہ بس سب ختم (Thats All) اور اس نے جواب دیا۔ جی جناب

اس پر بھٹو صاحب نے کہا کہ میں نے شیو کرنی ہے اور میرے کپڑوں کا کیا ہو گا اور پھر کہنے لگے میری وصیت کا کیا ہو گا جس پر چودھری یار محمد نے انہیں بتایا کہ ان کو وقت دیا جائے گا تاکہ وہ اپنی وصیت لکھ سکیں۔

جیل سپرنٹنڈنٹ کے ہٹ جانے کے بعد باپ' بیٹی نے اپنی باتیں شروع کر دیں۔ مجھے بعد میں بتایا گیا کہ بیگم نصرت بھٹو تقریباً پوری ملاقات میں خاموش رہیں۔ محترمہ بے نظیر زیادہ وقت روتی رہیں اور بھٹو صاحب سے باتیں کرتیں رہیں۔ بھٹوز نے چاہا کہ وہ ملاقات جاری رہے لیکن جیل حکام نے دو بجے بعد دوپہر ملاقات ختم کرا دی۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ بھٹو صاحب کے باقی رشتہ داروں نے بھی ان سے ملنا ہے۔ یہ آخری ملاقات تقریباً اڑھائی گھنٹے جاری رہی۔

ملاقات کے فوراً بعد بیگم نصرت بھٹو نے جیل ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سے' جو ان کے ساتھ سیکورٹی وارڈ سے آ رہا تھا' سے کہا کہ وہ کرنل رفیع سے ملنا چاہتی ہیں۔ میں اس وقت جیل سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ اطلاع ملنے پر ماں' بیٹی سے ڈیوڑھی کے گیٹ سے جیل کی جانب ملا۔ میں نے ان دونوں کو غم میں ڈوبا ہوا اور کافی نڈھال پایا۔ محترمہ بے نظیر نے سن گلاسز پہن رکھے تھے جن کے شیشے اوپر گہرے اور نیچے ہلکے رنگ کے تھے۔ ان کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخ اور سوجی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ بیگم بھٹو نے مجھے اپنے نزدیک بلا کر بتایا کہ وہ جنرل ضیاء الحق سے ذاتی رحم کی اپیل کرنا چاہتی ہیں اور میں ان کی اس سلسلے

میں کیامدد کر سکتاہوں۔ اس سے پہلے حکام نے مجھے سختی سے حکم دیا تھا کہ میں اکیلے میں بھٹو صاحب سے نہیں ملوں گا، جس کا ذکر میں پہلے کر چکاہوں۔ میں کچھ اچنبھے میں پڑ گیا۔ پھر میں نے انہیں بتایا کہ میرا جنرل ضیاء صاحب کے ساتھ کوئی ذاتی رابطہ (Contact) نہیں ہے، بہر حال میں کوشش کروں گا کہ ان کی اس خواہش کو جنرل صاحب تک پہنچادوں۔ مجھے محترمہ بے نظیر نے بتایا کہ اگر فیصلہ یہی رہا تو بھٹو صاحب اپنے علاقہ لاڑکانہ میں دفن ہونا چاہیں گے۔ اسی وقت بیگم بھٹو نے کہا کہ اگر ان کی رحم کی اپیل منظور نہیں ہوتی توان دونوں کی درخواست ہے کہ انہیں بھٹو صاحب کی میت کے ساتھ جانے دیا جائے تاکہ وہ ان کی آخری رسومات میں حصہ لے سکیں۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ ہمارے بہت ہی قریب آکر ہر لفظ کو سننا چاہتا تھا اس لئے میں کھل کر کوئی بات نہ کر سکتا تھا۔ بہرحال میں نے انہیں بتایا کہ وہ دفتر میں انتظار کریں، میں کوشش کرتاہوں کہ ان کی درخواست صدر صاحب تک پہنچادوں۔ جب ہم ڈیوڑھی سے گزر رہے تھے تو موقع پاکر میں نے بیگم بھٹو کے کان میں کہا کہ بھٹو صاحب کی میت لاڑکانہ ہی کی طرف لے جائی جائے گی۔ انہیں ڈپٹی کے دفتر میں بٹھایا اور میں نے جیل سپرنٹنڈنٹ کے دفتر سے صدر صاحب کے ملٹری سیکرٹری کو دو تین مرتبہ ٹیلیفون کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار ان کا ٹیلیفون مصروف ملا۔ میں اور وقت ضائع کرنے کی بجائے جیل سے باہر نکلا اور سڑک پار کر کے سامنے ایس ایس پی کے دفتر گیا جہاں ایس ایم ایل اے بریگیڈیئر خواجہ راحت لطیف (بعد میجر جنرل) ڈی سی راولپنڈی اور ایس ایس پی راولپنڈی بیٹھے تھے۔ میں نے ایس ایم ایل اے صاحب کو بیگم بھٹو کی درخواست سنائی۔ وہ مجھ پر برس پڑے کہ ان کے حکم کے خلاف ورزی کرتے ہوئے میں بھٹو بیگمات سے کیوں ملاہوں۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے آپ نے جیل میں رکھاہواہے۔ بھٹو صاحب سے بیگمات کی ملاقات کے بعد وہ سیدھی میرے پاس آئیں اور مجھے یہ درخواست جنرل ضیاء الحق صاحب کو پہنچانے کیلئے دی ہے۔ انہوں نے تھوڑی دیر خاموش رہ کر کچھ سوچا اور پھر کہنے لگے لیکن آپ کو ان سے نہیں ملنا چاہئے تھا۔ میں نے دوبارہ ان کو وہی جواب دیا۔ اتنی دیر میں ڈی سی راولپنڈی، محمد سعید مہدی نے ایس ایم ایل اے سے کہا کہ جناب آپ یہی درخواست ڈی ایم ایل اے کو پہنچادیں اور اگر انہوں نے مناسب سمجھا تو جنرل ضیاء الحق صاحب کو پہنچادیں گے۔ خدا خدا کر کے یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی اور میری خلاصی ہوئی مجھے بعد میں پتہ چلا کہ ڈی ایم ایل اے جنرل صغیر حسین سید نے جنرل ضیاء الحق صاحب کو بیگم بھٹو کی اپیل پہنچادی اور انہیں جنرل ضیاء الحق صاحب نے بیگمات سے ملنے کیلئے سہالہ ریسٹ ہاؤس بھیجا جہاں بیگم بھٹو نے تحریری اپیل کی درخواست صدر صاحب کے لئے پیش کی مگر ان کی رحم کی اپیل کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلے والی اپیلوں کا ہو چکا تھا۔

جیل کے باہر عوام کا اچھا خاصا ہجوم، جس میں ملکی وغیر ملکی اخباری نمائندے بھی موجود تھے، اکٹھا ہو چکا تھا۔ حکام نہیں چاہتے تھے کہ کسی کو بھٹو صاحب کی پھانسی کی خبر ہو اور ڈر تھا کہ بیگم بھٹو جیل سے نکلتے وقت کار کی کھڑکی کا شیشہ نیچے کر کے اخباری نمائندوں کو ان کی پھانسی کی اطلاع دیدیں گی۔ ایس ایس پی

سے کہا گیا کہ پولیس ہجوم کو جیل کے بڑے گیٹ سے جنوب کی جانب یعنی آرمی ہاؤس کی طرف ہٹوا دے اور بھٹو خواتین کی کار شمال کی جانب براستہ ایئرپورٹ نکال لی جائے۔ یوں ان کی کار عوامی ہجوم سے بچا کر شمالی سمت سے سہالہ ریسٹ ہاؤس لے جائی گئی۔

ادھر سہالہ ریسٹ ہاؤس کو باہر کی دنیا سے کاٹ دیا گیا۔ اس علاقے کو پولیس نے گھیرے میں لے لیا' نہ کوئی اندر جا سکتا تھا اور نہ ہی کسی نوکر وغیرہ کو اگلی صبح یعنی چار اپریل تک باہر نکلنے دیا گیا۔ ٹیلیفون وغیرہ کا رابطہ تو پہلے ہی منقطع کر دیا گیا تھا۔

بھٹو صاحب سے ان کے دوسرے رشتہ داروں کی ملاقات کیوں نہ کرائی گئی؟

بھٹو صاحب کے کچھ رشتہ دار مثلاً مسٹر نبی بخش بھٹو' مسٹر پیر بخش بھٹو' مسٹر ممتاز علی بھٹو' مسٹر اور بیگم منور الاسلام اور مسٹر پرویز علی بھٹو 2 اور 3 اپریل 1979ء کو راولپنڈی میں موجود تھے اور انہوں نے 3 اپریل کو بعد دوپہر بھٹو صاحب کے ساتھ آخری ملاقات کرنی تھی۔ اس کے لئے جیل حکام کو حکم مل چکا تھا اور بندوبست بھی کر دیا گیا تھا لیکن جونہی بیگم بھٹو اور محترمہ بے نظیر کی ملاقات ختم ہوئی تو حکومت کی طرف سے یہ پیغام ملا کہ بھٹو صاحب سے اب کسی اور رشتہ دار کی ملاقات نہیں کرائی جائے گی۔ شاید حکومت بھٹو صاحب کی پھانسی کی خبر کو پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی اور اگر ان رشتہ داروں کی آخری ملاقات بھٹو صاحب سے کرائی جاتی تو وہ جیل سے باہر نکل کر یہ خبر منتشر کر دیتے۔

مسٹر بھٹو کو پھانسی کی سرکاری اطلاع:۔ ایس ایم ایل اے کے حکم کے مطابق مندرجہ ذیل افسران نے تین اپریل شام چھ بجے مسٹر بھٹو کے سیل میں جا کر انہیں ان کی پھانسی کی اطلاع دینی تھی۔

ا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ' مسٹر یار محمد۔

ب۔ سیکورٹی بٹالین کمانڈر' لیفٹننٹ کرنل رفیع الدین۔

ج۔ مجسٹریٹ درجہ اول' مسٹر بشیر احمد خان۔

د۔ جیل ڈاکٹر' مسٹر صغیر حسین شاہ۔

یہ پارٹی شام چھ بج کر پانچ منٹ پر سیکورٹی وارڈ میں بھٹو صاحب کے سیل میں داخل ہوئی تو وہ گدے کے اوپر' جو سیل میں فرش پر شمالاً جنوباً بچھا ہوا تھا' لیٹے ہوئے تھے۔ ان کا سر اور کندھے سیل کی شمالی دیوار کے ساتھ آرام دہ حالت میں تھے۔ سپرنٹنڈنٹ جیل' یار محمد نے بھٹو صاحب کو پڑھ کر یہ حکم سنایا۔

"آپ' مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو لاہور ہائیکورٹ نے 18 مارچ 1978ء کو نواب محمد احمد خان کے قتل کے جرم میں پھانسی کی سزا سنائی تھی۔ آپ کی اپیل سپریم کورٹ پاکستان نے 6 فروری 1979ء کو نامنظور کر دی اور ریویو پٹیشن کو بھی 24 مارچ 1979ء کو نامنظور کر دیا گیا۔ صدر پاکستان نے اس کیس میں مداخلت نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس لئے آپ کو اب پھانسی دینے کا فیصلہ ہوا ہے۔"

جیل سپرنٹنڈنٹ جب یہ حکم سنا رہا تھا تو بھٹو صاحب گدے پر اسی طرح بغیر کسی گھبراہٹ یا پریشانی

کے لیٹے رہے۔ بلکہ ان کے جسم اور چہرے پر زم نازک ڈھیلا پن اور مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس وقت میں ان کے پاؤں کے نزدیک مغربی رخ اور جیل سپرنٹنڈنٹ ان کے پاؤں کے مشرقی رخ کھڑے تھے۔ بھٹو صاحب نے جس خندہ پیشانی کے ساتھ اپنی پھانسی کی خبر سنی اس پر میں نہ صرف حیران ہوا بلکہ میرے اندر میرا ضمیر مجھ سے بغاوت کر رہا تھا۔ میں اپنے آپ سے کہہ رہا تھا کہ اس لیڈر کو ہم پھانسی لگا رہے ہیں جو اپنی موت کی خبر اس خندہ روئی اور بے نیازی سے سن رہا ہے۔ مجھے اپنے اندر سے آواز سنائی دے رہی تھی کہ اس شخص کی موت ہماری قوم اور ہمارے ملک کیلئے سب سے بڑا المیہ ثابت ہوگی۔ میں شاید زندگی میں پہلی دفعہ خود پر ہر طرح کا کنٹرول ختم ہوتا محسوس کر رہا تھا۔ بھٹو صاحب نے جیل سپرنٹنڈنٹ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حاکمانہ انداز میں کہا (انگریزی میں تحریر شدہ الفاظ بھٹو صاحب کے اپنے الفاظ ہیں)

ا۔ پھانسی سے 24 گھنٹے پہلے مجاز اور مستند حاکم کے ذریعے مجھے بتایا جانا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ اس کے برخلاف جب آج ساڑھے گیارہ بجے میری بیٹی اور میری بیوی مجھ سے ملیں تو ان کو بھی یقین نہ تھا۔ میں نے جیل سپرنٹنڈنٹ کو بلایا اور اس سے ضروری وضاحت کیلئے کہا' تب اس نے مجھے غیر مشروط طور پر بتایا کہ میری پھانسی کا حکم اسے مل گیا ہے جو اس کے پاس ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ میرے دوسرے رشتہ دار جن میں میری بہن منور الاسلام اور میرا چچازاد بھائی ممتاز علی بھٹو' میری بیوی اور بیٹی کے چلے جانے کے بعد مجھ سے ملیں گے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ ملاقاتیوں کے بعد وہ خود بعد دوپہر ایک بج کر پچاس منٹ پر میری وصیت کے لئے آئے گا۔

I should have been informed by the competent authority 24 hours prior to the execution, but it has not been done. On the contrary when my daughter and wife met me today at 11:30 hours, they were not sure about it. I called Jail superintendent and asked him necessary clarification. He then told me vaguely that the necessary order for the execution has been passed and it is with him. He also told me that my relations; my sister Monawar ul Islam and my cousin, Mr. Mumtaz Ali Bhutto would be seeing me after my daughter and wife left me. He also told me that after the visitors, he would come himself to get my 'will' etc. at 13:50 hours.

ب۔ میری پھانسی کا کوئی لکھا ہوا حکم مجھے ابھی تک نہیں دکھایا گیا۔

No written order for my execution has been shown to me so far.

ج ۔ میں اپنے وکلاء کو جتنا جلد ہو سکے ملنا چاہتا ہوں ۔

I want to see my counsels as soon as possible.

د ۔ میرے دوسرے رشتہ داروں کو مجھے ملنے کی اجازت دی جانی چاہئے تھی ۔

My other relative should have been allowed to see me.

ر ۔ میرے دانت بہت سخت خراب ہیں اور میں اپنے معالج مسٹر ظفر نیازی سے فوراً ملنا چاہتا ہوں ۔
My teeth are very bad and I would like to see my dentist, Mr. Zafar Niazi, immediately

بھٹو صاحب کے ان الفاظ کے فوراً بعد مجسٹریٹ درجہ اول مسٹر بشیر احمد خان نے اپنے آپ کو متعارف کرایا اور بھٹو صاحب سے کہا کہ اگر وہ چاہیں تو اپنی وصیت لکھ سکتے ہیں ۔ جس کیلئے کاغذ وغیرہ مہیا کر دیا جائے گا ۔ یہاں جیل سپرنٹنڈنٹ کا سرکاری پیغام ختم ہوا اور پارٹی جانے لگی ۔ میری اس وقت عجیب کیفیت تھی ۔ میں کچھ حواس باختہ سا تھا ' یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں ایک پتھر بن گیا ہوں ۔ اتنے میں بھٹو صاحب اٹھے اور پہلا قدم لینے پر لڑکھڑائے ۔ میں نے انہیں بازو سے تھام کر سہارا دیا ۔ کہنے لگے میرے پیٹ میں لاغری ہے ۔ (I am feeling sickness in my tummy)
انہوں نے جونہی اپنے آپ کو سنبھالا تو کہنے لگے رفیع میں ٹھیک ہوں ۔ میں نے انہیں جواب دیا کہ آپ کی ہمت فولادی ہو سکتی ہے " لیکن جسم کو قوت کیلئے خوراک چاہئے ' آپ نے کئی دنوں سے کچھ نہیں کھایا ۔ انہوں نے مجھے تھپتھپایا ۔ انہوں نے بے حد ہمت دکھائی ' وہ اس وقت تک مسکرا رہے تھے ۔ اس اثنا میں جیل سپرنٹنڈنٹ ' کو جو سیل سے باہر نکل چکا تھا ' ایک وارڈر نے بتایا کہ ان کے لئے ٹیلیفون کال ہے (یہ ٹیلیفون ڈیوٹی آفیسر اور جیل کے دفتر تک محدود تھا) ڈاکٹر اور مجسٹریٹ بھی چودھری یار محمد کے پیچھے پیچھے سیل سے باہر چلے گئے تھے ۔ بھٹو صاحب نے مشقّتی عبدالرحمٰن کو آواز دی جو فوراً سیل میں آیا اور بھٹو صاحب نے اسے گرم پانی لانے کو کہا اور کہنے لگے کہ میں شیو کرنا چاہتا ہوں (لمبی بھوک ہڑتال کے دوران انہوں نے شیو تک کرنا چھوڑ دیا تھا) پھر کہا کہ میں بلڈی مُلّا نہیں کہ ایسی حالت میں خداوند تعالیٰ کے سامنے جاؤں ۔ بھٹو صاحب نے مشقّتی کو گرم پانی لانے کو کہا اور بعد میں میری طرف متوجہ ہوئے ' کہنے لگے ! رفیع یہ کیا ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے ؟

Rafi ! what is this drama being played ?

میری لمحہ بھر خاموشی پر دوبارہ کہا ۔ رفیع یہ کیا ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے ؟ میں نے جواب دیا ! جناب میں نے کبھی آپ کے ساتھ مذاق کیا ہے ؟ ۔ Sir, Have I ever tried to be funny with you .
انہوں نے فوراً کہا تمہارا کیا مطلب ہے ؟ پھر دہرایا ' تمہارا کیا مطلب ہے ؟ میں نے جواب دیا ' جناب آخری

حکم مل گیا ہے ' آج آپ کو پھانسی دی جا رہی ہے۔

مسٹر بھٹو میں پہلی مرتبہ میں نے وحشت کے آثار دیکھے۔ انہوں نے اونچی آواز میں اپنے ہاتھ کو ہلاتے ہوئے کہا بس ختم ہے، بس ختم۔

میں نے جواب میں کہا ' جی جناب۔

بھٹو صاحب کی آنکھیں وحشت اور اندرونی گھبراہٹ سے جیسے پھٹ گئی ہوں۔ ان کے چہرے پر پیلاہٹ اور خشکی آ گئی جو میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ میں اس حالت کو صحیح بیان نہیں کر سکتا۔

انہوں نے کہا ' کس وقت ؟ پھر کہا! کس وقت اور پھر کہا آج ؟ میں نے اپنے ہاتھوں کی سات انگلیاں ان کے سامنے کیں جیسے ایک جمپ ماسٹر پیراجمپ سے پہلے ہاتھوں سے وقت بتاتا ہے۔

انہوں نے کہا سات دن بعد۔

میں نے ان کے نزدیک ہو کر سرگوشی میں بتایا۔ جناب گھنٹے۔

انہوں نے کہا آج رات سات گھنٹوں بعد۔ میں نے اپنا سر ہلاتے ہوئے ہاں میں جواب دیا۔

بھٹو صاحب جب سے پنڈی جیل میں لائے گئے اس وقت سے وہ ایک مضبوط اور سخت چٹان بنے ہوئے تھے لیکن اس موقع پر وہ بالکل تحلیل ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ جس نے مجھے زندگی کی حقیقت سے روشناس کر دیا۔

چند لمحوں کے وقفے کے بعد انہوں نے کہا۔ رفیع بس! میں نے اپنے سر کو ہلاتے ہوئے ہاں کا اشارہ کیا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے بھٹو صاحب کو بتایا کہ بیگم بھٹو اور محترمہ بے نظیر نے ان سے آخری ملاقات کے بعد مجھ سے ملاقات کی تھی اور میں نے ان کی اپیل جنرل ضیاء الحق صاحب تک پہنچانے میں کیا کردار سرانجام دیا۔ اس دوران بھٹو صاحب مجھے گھبراہٹ کے عالم میں اور بے حد کمزور محسوس ہوئے تو میں نے ان کو سہارا دے کر سیل میں پڑی کرسی پر بٹھانا چاہا۔ انہوں نے بیٹھتے وقت مجھے اشارہ کیا کہ ان کی بجائے میں بیٹھوں لیکن میں نے انہیں زبردستی کرسی پر بٹھا دیا اور نزدیک کونے میں پڑے کموڈ کے **ڈھکن** کو اس کے اوپر بند کرتے ہوئے اٹھایا اور ان کی کرسی کے سامنے رکھ کر اس کے اوپر بیٹھ گیا اور بیگمات کی اپیل کا قصہ ان کے گوش گزار کر دیا اور امید ظاہر کی کہ شاید بیگم صاحبہ اس وقت تک جنرل ضیاء الحق صاحب سے مل چکی ہوں گی اور امید کرتا ہوں کہ اللہ کوئی بہتر صورت پیدا کر دے۔ بہرحال میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے۔ مسٹر بھٹو جذبات کے تحت اپنی کرسی سے آگے لپکے اور مجھے اپنی چھاتی سے لگا لیا اور فرمایا۔ تم ایک بہادر شخص ہو ' کاش میں تمہیں پہلے سے جانتا ہوتا۔ اس حالت میں ' مَیں نے ان کے جسم میں ایک خفیف سی لرزش محسوس کی ' لیکن ان کی گھبراہٹ کافی حد تک کم ہو چکی تھی اور میں نے انہیں تقریباً نارمل حالت میں محسوس کیا۔

تھوڑے وقفے کے بعد انہوں نے خود کلامی کے انداز میں کہا!

میرے وکلاء نے اس کیس کو خراب کیا ہے۔ یحیٰی میری پھانسی کا ذمہ دار ہے۔ وہ مجھے غلط بتاتا رہا۔ اس نے اس کا ستیاناس کیا ہے۔ اس نے ہمیشہ سبز باغ دکھائے۔

پھر کہنے لگے میری پارٹی کو مردہ بھٹو کی ضرورت تھی زندہ بھٹو کی نہیں۔ جب میں نے افسوس ظاہر کیا تو انہوں نے میرا ہاتھ تھام کر کہا!

مجھے افسوس ہے کہ میرے وکلاء کا برتاؤ آپ کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ میں نے فوراً کہا نہیں جناب انہوں نے میرے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ انہوں نے جواباً کہا' پیرزادہ اور یحیٰی نے آپ کے خلاف پریس میں سٹیٹمنٹس دیں۔ میں نے جواب میں بتایا' کہ مجھ سے کبھی کوئی پوچھ گچھ نہیں ہوئی اور آپ اس بات کا خیال نہ کریں۔

انہوں نے میری خوش اخلاقی اور ان کے ساتھ ہمیشہ شریفانہ برتاؤ کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے بھی ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے انہیں یاد دلایا کہ وہ اپنی وصیت لکھنا شروع کریں۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ان کے پاس بیٹھوں مگر مجھے سخت ہدایات مل چکی تھیں کہ ان کو اکیلا نہ ملوں۔ حالانکہ ان کے ساتھ کچھ اور وقت گزارنا بڑا مفید ہوتا اور میں بہت کچھ اس نازک وقت میں سن پاتا۔ اسی اثنا میں ایک وارڈر کچھ کاغذات اور کچھ لکھنے کا سامان لے کر اندر آ گیا اور میں بادلِ ناخواستہ ان کی مرضی کے برعکس سیل سے باہر آ گیا۔

جیسا کہ میں پہلے کئی بار لکھ چکا ہوں کہ بھٹو صاحب کو کبھی پھانسی کے پھندے تک جانے کا خیال تک نہ آیا اور وہ اس مقدمے کو ہمیشہ ایک سیاسی سٹنٹ ہی سمجھتے رہے۔ تین اپریل کو ان کی بیگم اور بیٹی کو تو معلوم ہو گیا تھا کہ حکومت ان کو پھانسی لگانے کا تہیہ کر چکی ہے لیکن بھٹو صاحب کو ابھی تک سب کچھ دکھاوا ہی معلوم ہو رہا ہو گا کیونکہ جیل حکام نے پھانسی لگنے سے سات دن پہلے ان کو سرکاری اطلاع نہ دی تھی۔ بیگمات کے انٹرویو کے دوران بھٹو صاحب نے جب جیل سپرنٹنڈنٹ کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا کہ میرے باقی رشتہ داروں کی ملاقات کب ہونی ہے تو ان کو بتایا گیا کہ بیگمات کی ملاقات کے بعد ہو گی۔ جیل سپرنٹنڈنٹ نے یہ بھی بتایا تھا کہ دوپہر دو بجے کے لگ بھگ وہ ان سے وصیت لکھوانے آئے گا' اسی وقت جب انہوں نے اپنی پھانسی کے حکم کے متعلق دریافت کیا تو بھی بتایا گیا تھا کہ تحریری حکم جیل سپرنٹنڈنٹ کو مل چکا ہے جو ان کو بیگمات کی ملاقات ختم ہونے پر دکھایا جائے گا۔

بعد میں شام چھ بجے کے فوراً بعد سرکاری حکام نے ان کو سرکاری طور پر سب کچھ بتا دیا تو بھی ان کو کچھ شک ضرور رہا ہو گا۔ لیکن جب انہوں نے مجھ سے اکیلے میں پوچھا کہ یہ کیا ڈرامہ ہو رہا ہے اور میں نے صاف بتا دیا تو کسی شک کی گنجائش باقی نہ رہی کیونکہ مجھ پر میرے خیال میں ان کا پورا اعتماد ہو چکا تھا۔ تب انہوں نے خود کو موت کے سامنے پایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آخر وہ انسان تھے' موت کا سامنا کرتے وقت گھبراہٹ ایک فطری بات ہے۔ سرکاری افسران اور میرے ان کے سیل سے باہر جانے کے بعد انہوں نے ڈپٹی

سپرنٹنڈنٹ خواجہ غلام رسول، جن کو میں نے ایک بڑا منجھا ہوا اور عقل مند جیل حاکم پایا، کی نگرانی میں شام سات بج کر پانچ منٹ پر شیو بنائی۔ شیو کے دوران انہوں نے ڈپٹی سے مندرجہ ذیل بات چیت کی۔

مسٹر بھٹو: ڈپٹی صاحب آپ لوگوں کو ایسا لیڈر کہاں سے ملے گا۔ مگر آپ کو ضرورت ہی کیا ہے ضرورت تو غریبوں کو تھی۔ میں موچی دروازے میں موچیوں کے سامنے تقریریں کیا کرتا تھا کیونکہ میں خود موچی ہوں۔ تم لوگ غریبوں کا لیڈر چھین رہے ہو۔ میں انقلابی آدمی ہوں۔ غریبوں کا حامی۔ یار مجھے مارنا ہی تھا تو دو سال خراب کیوں کیا۔ میری عزت کیوں نہیں کی جو ساری دنیا میں ہے۔ مجھے کسی ریسٹ ہاؤس یا کسی کوٹھی میں رکھتے اور عزت سے مار دیتے۔ آج اسلامی کانفرنس کے چیئرمین کو جسے ساری دنیا کے مسلمانوں نے منتخب کیا ہے شیو کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ ساتھ کھڑے ہو تاکہ بلیڈ سے خود کو ضرب نہ لگالوں۔ دوسری بات، ہاں تجھے یار میں نے بہت تنگ کیا ہے۔ مجھے معاف کر دینا، دوسرے مجرموں سے جھوٹ بکواس کرا کر مجھے پھانسی کے پھندے پر چڑھا کر انہیں چھوڑنا چاہتے ہو۔

پھر انہوں نے باہر والے سنتری کو بلایا اور ڈپٹی صاحب سے کہا میرے مرنے کے بعد یہ گھڑی اس سپاہی کو دیدینا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے جواب دیا۔ ٹھیک ہے جناب۔ (اس وقت فوج کی گارد بھی لگ چکی تھی اور وہ جوان حوالدار مہدی خان 27 پنجاب کا تھا)

شام آٹھ بج کر پانچ منٹ پر جب مشقتی عبدالرحمٰن نے بھٹو صاحب کے کہنے پر کافی کا کپ بنا کر دیا تو بھٹو صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور انہوں نے اس سے کہا، رحمٰن مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو مجھے معاف کر دینا۔ پھانسی تو لگ ہی جانا ہے آج میری آخری رات تیرے ساتھ ہے۔ میں صرف چند گھنٹوں کے لئے تیرا مہمان ہوں۔

بھٹو صاحب آٹھ بج کر پندرہ منٹ سے نو بج کر چالیس منٹ تک اپنی وصیت لکھتے رہے۔ اس کے بعد تقریباً دس منٹ (نو بج کر چالیس منٹ سے نو بج کر پچاس منٹ تک) وہ ٹیبل پر شیشہ، کنگھی، بالوں کا برش، تیل کی بوتل اور جائے نماز، تولیہ بچھا کر اس کے اوپر رکھتے اور ہٹاتے رہے۔

پھر نو بج کر پچپن منٹ تک اپنے دانت برش کے ساتھ صاف کئے اور منہ ہاتھ دھویا، بالوں کو کنگھی سے سنوارا۔

پھر تقریباً پانچ منٹ کیلئے سگار کی راکھ اور چند جلے ہوئے کاغذوں کی راکھ ایک کاغذ کی مدد سے صاف کرتے رہے۔

دوبارہ شام دس بج کر دس منٹ سے گیارہ بج کر پانچ منٹ تک لکھتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے تمام کاغذات جو انہوں نے لکھے تھے جلا ڈالے۔ جلے ہوئے کاغذات کی راکھ سارے سیل میں پھیل گئی۔ انہوں نے مشقتی عبدالرحمٰن کو بلایا اور اسے سیل صاف کرنے کو کہا۔ انہوں نے سنتری سے پوچھا کتنا وقت رہ گیا ہے۔ سنتری نے جواب دیا کہ جناب کافی وقت ہے۔ کہنے لگے، کتنا؟...... ایک گھنٹہ...... دو

گھنٹے مگر سنتری خاموش رہا۔ پھر خود ہی کہا کہ ایک دو گھنٹے سو سکتا ہوں۔ سنتری نے جواباً کہا جی جناب۔ پھر کہا، کہیں جگا تو نہیں دو گے۔

گیارہ بج کر دس منٹ پر سیل کھولا گیا اور مشقتی عبدالرحمٰن اندر گیا اور برش سے فرش صاف کیا اور ساری راکھ باہر نکال دی۔ پھر سیل بند ہوا اور بھٹو صاحب خاموشی سے لیٹ گئے۔

گیارہ بج کر پچیس منٹ پر کہا کہ میں کوشش کرتا ہوں کہ تھوڑی دیر سو لوں کیونکہ میں کل رات نہیں سویا۔ ویسے مجھے پتہ ہے کہ آپ لوگ مجھے بارہ بجے جگا دیں گے۔ کچھ دیر بعد لیٹے ہوئے انہوں نے صنم، صنم پکارا۔

گیارہ بج کر پچاس منٹ پر اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مجید احمد قریشی اور کاظم حسین بلوچ آئے۔ انہوں نے باہر سے ہی مسٹر بھٹو صاحب کو جگانے کی کوشش کی، مگر وہ نہ جاگے۔ مسٹر قریشی نے جیل دفتر ٹیلیفون کر کے پوچھا کہ کیا، کیا جائے۔ انہیں بتایا گیا کہ سیل کھول کر اندر جا کر مسٹر بھٹو صاحب کو جگائیں۔ مسٹر قریشی نے سیل کھول کر اندر، بھٹو صاحب کو جگانے کی کوشش کی مگر انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مسٹر قریشی نے ٹیلیفون پر دفتر میں اطلاع دی کہ بھٹو صاحب کوئی جواب نہیں دے رہے، جیسے کہ وہ بے ہوش ہیں۔ مجھے اس خبر پر کافی فکر لاحق ہوئی کیونکہ میرے فرائض میں سے ایک فرض یہ بھی تھا کہ بھٹو صاحب کسی حالت میں بھی خودکشی نہ کریں۔

رات بارہ بجنے میں سے ایک منٹ کم میں، جیل سپرنٹنڈنٹ، جیل ڈاکٹر اور مجسٹریٹ کو لے کر سیکورٹی وارڈ کے سیل میں داخل ہوا۔ بھٹو صاحب سیل میں گدّے پر شمالاً جنوباً بائیں پہلو سے لیٹے ہوئے تھے اور ان کا منہ سیل کے دروازے کی طرف تھا۔ جب سیل کا تالا کھولا جا رہا تھا تو چودھری یار محمد اور جیل ڈاکٹر نے دیکھا کہ بھٹو صاحب نے اپنی ایک آنکھ کھول کر ہم سب کو دیکھا اور پھر آنکھ بند کر لی۔ میں نے اور چودھری یار محمد نے اندر داخل ہوتے ہی بار بار بھٹو صاحب کا نام لے کر پکارا مگر انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے جیل ڈاکٹر صغیر حسین شاہ صاحب سے کہا کہ وہ بھٹو صاحب کو چیک کریں۔ ڈاکٹر نے بھٹو صاحب کی نبض محسوس کی اور پھر سٹیتھو سکوپ کے ساتھ ان کے سینے کا معائنہ کیا اور ان کی آنکھ کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور میرے کان میں بتایا کہ بھٹو صاحب ٹھیک ہیں۔ میں نے بھٹو صاحب کو پھر آواز دی مگر انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے ان پر جھک کر ان کے کندھے کو ہلایا اور ان کو پھر پکارا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے ڈاکٹر سے پھر کہا کہ ان کو چیک کریں۔ ڈاکٹر نے ایک بار پھر ان کی نبض اور چھاتی کا معائنہ کیا اور اٹھ کر میرے کان میں سرگوشی کے ساتھ بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ میں نے ڈاکٹر کو سیل سے باہر بلایا اور دالان میں ان سے کہا کہ بھٹو صاحب جواب کیوں نہیں دے رہے؟ ڈاکٹر نے مجھے یقین دلایا کہ بھٹو صاحب بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں اور میں فکر نہ کروں۔ پھر چودھری یار محمد نے مجھے بتایا کہ جب دروازے کا تالا کھولا جا رہا تھا تو بھٹو صاحب نے ایک آنکھ کھول کر ہم سب کو دیکھا اور پھر آنکھ بند کر لی، وہ

مکر کر رہے ہیں اور بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ ڈاکٹر نے بھی جیل سپرنٹنڈنٹ کی طرح بتایا کہ اس نے بھی بھٹو صاحب کی ایک آنکھ کھلی، بند ہوتے دیکھی تھی۔ پھر کہا ان کا دل، نبض اور آنکھ کی پتلی بالکل ٹھیک ہیں اور وہ یہ سب کچھ مکر کے طور پر کر رہے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر کو بتایا کہ اگر بھٹو صاحب کو کچھ ہو گیا تو وہ ذمہ دار ہو گا اور اسے فوجی طریقے سے حکم دیا کہ وہ بھٹو صاحب کو پھر چیک کرے۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے کہنے پر تیسری بار بھٹو صاحب کو چیک کیا اور دالان میں آ کر مجھے بتایا کہ کرنل صاحب آپ فکر نہ کریں، بھٹو صاحب بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں اور وہ جان بوجھ کر اس طرح کر رہے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر، مسٹر قریشی اور مسٹر بلوچ کو سیکورٹی وارڈ ہی میں رہنے دیا اور ہم واپس دفتر آ گئے۔ آتے ہوئے میں نے ڈاکٹر صاحب سے پھر کہا کہ چند منٹوں بعد بھٹو صاحب کو دوبارہ چیک کریں۔

رات ایک بج کر دس منٹ پر بھٹو صاحب خود اٹھ بیٹھے۔ مسٹر قریشی نے انہیں بتایا کہ نہانے کیلئے گرم پانی موجود ہے مگر بھٹو صاحب نے جواب دیا کہ اب وہ نہانا نہیں چاہتے۔

پھانسی: ..... حکم کے مطابق بھٹو صاحب کو 4/3 اپریل 1979ء کی درمیانی شب کو دو بجے، انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات کی موجودگی میں پھانسی لگانی تھی۔ انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات چودھری نظیر اختر راولپنڈی جیل میں 3 اپریل صبح سے حاضر تھے، جبکہ وہ یکم اپریل شام سے راولپنڈی آئے ہوئے تھے۔ بھٹو صاحب کی لمبی بھوک ہڑتال، جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، کی وجہ سے ان کی جسمانی حالت دیکھ کر ایک سٹریچر کا بھی بندوبست کر لیا گیا تھا کہ اگر وہ پھانسی گھاٹ تک چل کر نہ جا سکے تو ان کو اس پر لے جایا جائے گا۔ چند ایک پیٹرو میکس کا بھی بندوبست کر لیا گیا کیونکہ اس رات آسمان پر کافی بادل موجود تھے اور رات اچھی خاصی اندھیری تھی۔ مندرجہ ذیل افسران رات ایک بج کر پینتیس منٹ پر سیکورٹی وارڈ گئے۔

ا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل چودھری یار محمد

ب۔ کمانڈر سیکورٹی فورس لیفٹیننٹ کرنل رفیع الدین

ج۔ مجسٹریٹ درجہ اوّل ڈسٹرکٹ کورٹ راولپنڈی مسٹر بشیر احمد خان

د۔ راولپنڈی جیل ڈاکٹر صغیر حسین شاہ

ر۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل خواجہ غلام رسول

جبکہ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹس جیل مجید احمد قریشی، کاظم حسین بلوچ، محابت خان اور سپرنٹنڈنٹ جیل کے چناؤ کے مطابق چند وارڈرز بھی سیکورٹی وارڈ کے دالان تک مندرجہ بالا پارٹی (ا.....ر) کے پیچھے پیچھے گئے۔ انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات چودھری نظیر اختر دفتر سے سیدھے موت کے کنویں کی طرف ہی چلے گئے۔ سیکورٹی وارڈ، پھانسی گھاٹ اور ان کے درمیانی راستہ پر فوج کی فالتو گارد بھی متعین کر دی گئی تھی۔

مذکورہ پارٹی (ا.....ر) بھٹو صاحب کے سیل کے اندر گئی۔ بھٹو صاحب گدّے کے اوپر لیٹے ہوئے تھے اور جاگ رہے تھے۔ ان سے مجسٹریٹ مسٹر بشیر احمد خان نے کہا کہ کیا وہ کوئی وصیت چھوڑنا چاہتے

ہیں۔ بھٹو صاحب خاموش رہے۔ بھٹو صاحب کا رنگ بالکل پھیکا اور زرد پڑ چکا تھا اور وہ جسمانی لحاظ سے نقاہت کی حالت میں تھے۔ ان کی آواز خفیف ' بے حد کمزور تھی اور صاف سنائی نہ دے رہی تھی۔ انہوں نے کوشش کر کے کہا

"I had...tried...but...my...thoughts...were...so...upset...that...I...could... not...do..it...I...have..." burnt...it

میں.......... نے کوشش.......... کی.......... لیکن.......... میرے.......... خیالات.......... اتنے.......... درہم برہم.......... تھے.......... کہ میں.......... نہ لکھ.......... سکا.......... میں.......... نے.......... اسے.......... جلا دیا۔

میں نے قریب جا کر ان سے کہا کہ جناب آپ چل کر جائیں گے یا یہ آپ کو اٹھا کر لے جائیں۔ انہوں نے مجھے کوئی جواب نہ دیا بلکہ میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال کر دیکھتے رہے۔ چند لمحوں بعد میں نے اسی فقرے کو دہرایا۔ وہ مجھے اسی طرح دیکھتے رہے اور پھر کہا "مجھے.......... افسوس...... ہے" "I....Pity" " (انہوں نے کچھ کہا لیکن ہم میں سے کوئی بھی کچھ نہ سمجھ سکا)

میں نے آگے جا کر ان کے اوپر جھک کر کہا۔ معاف کیجئے گا میں آپ کو سمجھ نہیں سکا۔ انہوں نے اسی فقرے کو دہرایا، لیکن میں آخری ایک دو لفظ پھر بھی سمجھ نہ پایا۔ میں ان کے چہرے پر پوری طرح جھک گیا اور پھر ان سے کہا۔ معاف کیجئے گا میں آپ کو سمجھ نہیں سکا۔

وہ بے حد کمزوری اور وقفے وقفے کے ساتھ بولے۔

"I......Pity.....My....wife.....Left".

(مجھے.......... افسوس.......... ہے..... میری.......... بیوی.......... چلی گئی.......... ہے)

وہ بے حد پُراضطراراور دلسوز حالت تھی۔ میں بھٹو صاحب کے جواب کے ساتھ خاموش ہو گیا۔ شاید وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ وہ چل نہیں سکتے مگر یہ بھی نہیں چاہتے کہ انہیں اٹھا کر لے جایا جائے ' شاید وہ یہ سوچ رہے ہوں کہ اگر ان کی بیوی موجود ہوتی تو وہ انہیں سہارا دے کر لے جاتی۔

میں ان کے اس جواب پر بالکل شل اور بے حس ہو گیا۔

مجسٹریٹ نے دوبارہ آگے بڑھ کر ان سے پوچھا کہ آپ کچھ وصیت کرنا چاہتے ہیں۔ بھٹو صاحب خاموش رہے۔ مجسٹریٹ نے دوبارہ پوچھا کہ کیا آپ وصیت لکھوانا چاہیں گے۔ انہوں نے جواب دیا

"Yes....I.....would......like......to.....dictate.

ہاں.......... میں.......... لکھوانا.......... چاہوں گا۔

اس لمحے وقت ختم ہو چکا تھا اور جیل سپرنٹنڈنٹ نے ہیڈ وارڈر کو حکم دیا کہ وہ اپنے آدمی اندر لائے اور

مسٹر بھٹو کو اٹھالیں۔ چار وارڈر اندر داخل ہوئے اور دو نے بھٹو صاحب کے بازو اور دو نے ان کے پاؤں اور ٹانگیں پکڑ کر ان کو اوپر اٹھالیا جب ان کو اٹھایا جارہا تھا تو انہوں نے کہا۔

"مجھے چھوڑ دو" جب ان کو سیل سے باہر نکالا جارہا تھا تو ان کی کمر تقریباً فرش کے ساتھ لگ رہی تھی' ان کی قمیص کا پچھلا حصہ ان وارڈروں جو ان کی ٹانگوں کو پکڑے ہوئے تھے' کے پاؤں کے نیچے آیا اور قمیص پھٹنے کی آواز آئی۔ میں نے اس قمیص کا معائنہ تو نہیں کیا لیکن وہ بازوؤں کے نیچے تک ضرور ادھڑ گئی ہو گی یعنی ٹانکے کھل گئے ہوں گے۔ دالان میں ان کو سٹریچر پر ڈال دیا گیا۔ ان کے دونوں ہاتھوں میں ان کے پیٹ کے سامنے ہتھکڑی لگادی گئی۔ اتنی دیر میں مشقتی عبدالرحمٰن چائے کی پیالی لے کر سامنے آیا جو بھٹو صاحب نے ہمارے داخل ہونے سے پہلے اس سے کہی ہو گی۔ میں یہ سب دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی شان دیکھئے کہ جیل کی دیوار کے پار پرائم منسٹر ہاؤس میں بھٹو صاحب نے جو بھی چاہا دنیا کے کسی بھی حصے سے ان کیلئے فوراً مہیا کیا گیا اور آج ان کی یہ آخری اور معمولی سی خواہش بھی پوری نہ ہو سکی کہ چائے کی ایک پیالی بھی پی سکیں۔

چاروں وارڈروں نے سٹریچر کو چاروں کونوں سے اٹھالیا۔ بھٹو صاحب نے اپنا سر گردن پر تھامے ہوئے اوپر اٹھائے رکھا مگر ویسے بالکل بے حس رہے۔ ان کے پاؤں پیلے زرد نظر آرہے تھے جیسے کہ جسم میں خون بالکل کم ہو گیا ہو۔ سیل سے تقریباً دو سو یا دو سو پچاس (250) گز پھانسی گھاٹ تک وہ بالکل خاموش اور بغیر حرکت کے رہے۔ پھانسی کی جگہ وارڈروں نے سٹریچر کو زمین پر رکھا اور دو نے بھٹو صاحب کی بغلوں کے نیچے سے مدد کی اور وہ پھانسی کے تختے پر کھڑے ہو گئے۔ میں بھٹو صاحب کے نزدیک ترین رہا' صرف میں نے اپنے پاؤں پھٹے سے بچا کر رکھے لیکن میرے کان ان کے چہرے سے ایک یا دو فٹ ہی دُور رہے ان کے ہاتھوں سے ہتھکڑی نکال کر ان کے بازو اور ہاتھ ان کی کمر کے پیچھے ایک جھٹکے سے لے جائے گئے اور پھر ہتھکڑی لگادی گئی۔ اسی دوران تارا مسیح نے ان کے سر اور چہرے پر ماسک چڑھادیا۔ یا تو انہیں چہرے پر ماسک کی وجہ سے سانس لینے میں دِقّت ہوئی یا ہاتھوں کو مروڑتے ہوئے جب ان کو کمر کے پیچھے ہتھکڑی لگائی گئی تو لوہے کی ہتھکڑی نے ان کی کلائیوں کو دبایا جس کی وجہ سے ان کو تکلیف ہوئی اس لئے انہوں نے کہا "یہ مجھے" شاید وہ کہنا چاہتے ہوں کہ یہ مجھے تکلیف دے رہی ہے۔ میں ان کے بالکل نزدیک تھا یعنی میں تختے سے بچتے ہوئے آگے ان کی طرف اتنا جھکا ہوا تھا کہ ان کے منہ اور میرے کانوں میں ایک' دو فٹ کا فاصلہ ہو گا مگر میں ان کی یہ آخری بات پوری نہ سن سکا۔ ٹھیک دو بج کر چار منٹ پر' چار اپریل 1979ء کو جلاد نے لیور دبایا اور بھٹو صاحب ایک جھٹکے کے ساتھ پھانسی کے کنویں میں گر پڑے۔ میں اوپر سے سیڑھیوں کے ذریعے اتر کو کنویں کے کھلے رخ نیچے گیا اور دیکھا کہ بھٹو صاحب کا جسم معمولی ہل رہا تھا جو اوپر سے نیچے گرنے کی وجہ سے تھا لیکن وہ اس وقت مردہ حالت میں تھے۔ میں انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات کے پاس ان کرسیوں پر آکر بیٹھ گیا جو لٹکی ہوئی لاش کے سامنے رکھی ہوئی تھیں۔

میں نے دیکھا کہ بھٹو صاحب کا سر ان کی گردن پر بائیں طرف جھک گیا تھا کیونکہ پھانسی کے پھندے کا رسا ان کی دائیں طرف سے اوپر گیا ہوا تھا۔

بھٹو صاحب کی لاش کا اس طرح لٹکنا میرے لئے ایک نہ بھلا سکنے والا منظر ہے۔ میں آج تک جب بھی اس کا تصوّر کرتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

چند منٹوں بعد میں نے کسی کو کنویں میں بھٹو صاحب کے جسم کو ہلاتے ہوئے دیکھا۔ میں نے چودھری یار محمد' جو میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے' سے پوچھا کہ کنویں میں بھٹو صاحب کی نعش کے ساتھ کون ہے؟ ان کی بجائے مجھے آئی جی پریزن (IG Prisons) نے بتایا کہ وہ تارا مسیح ہے اور ہاتھوں اور ٹانگوں کو سیدھا کر رہا ہے تاکہ تشنج کی وجہ سے ان کا جسم ٹیڑھا نہ ہو جائے۔ (جب میں پچھلی شام آئی جی جیل خانہ جات اور جیل سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ ان کے جیل دفتر میں بیٹھا تھا تو کسی اسسٹنٹ نے بتایا تھا کہ بھٹو صاحب نے کہا ہے کہ ان کی پھانسی کے بعد ان کی گھڑی اس وقت کے سنتری کو دیدی جائے۔ اس پر اچھی خاصی بحث چل نکلی تھی۔ آئی جی صاحب نے کہا کہ یہ گھڑی بڑی قیمتی ہوگی' کم از کم کئی ہزار روپے کی تو ہوگی۔ جیل سپرنٹنڈنٹ نے فوراً کہا تھا کہ یہ قانونی طور پر ان کی ملکیت ہونی چاہئے۔ میں اس وقت سوچ رہا تھا کہ کسی نے خوب کہا ہے کہ "بکرے کو جان کی اور قصاب کو چربی کی"۔ میں نے اسی وقت یہ کہہ دیا تھا کہ یہ گھڑی ممکن ہے ان کی شادی کی ہو' ویسے بھی اسے بیگم بھٹو کے حوالے کر دینا چاہئے) قانون کے مطابق پھانسی کے بعد نعش کو تیس منٹ تک لٹکنا چاہئے اور پھر ڈاکٹر کے اس سرٹیفکیٹ کے بعد کہ موت واقع ہو چکی ہے' نعش کو اتارا جاتا ہے۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ بھٹو صاحب کی گھڑی اور ان کی انگلی پر انگشتری اتار لینی چاہئے۔ میں نے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ قریشی کو بلایا اور ان سے کہا کہ بھٹو صاحب کی گھڑی اور انگوٹھی اتار لی جائے۔ وہ بھٹو صاحب کی گھڑی تو اتار کر لے آئے مگر کہنے لگے کہ ان کے ہاتھ پر انگشتری نہیں ہے۔ بھٹو صاحب جب بھی بیٹھ کر میرے سامنے گپ شپ لگایا کرتے تھے تو عموماً وہ اپنی انگشتری کے ساتھ کھیلتے رہتے تھے' یعنی اسے اپنی انگلی کے اردگرد پھیرتے رہتے تھے۔ میں نے مسٹر قریشی کو بتایا کہ میں نے آج ہی ان کی انگلی پر انگوٹھی کو دیکھا تھا۔ آئی جی پریزن نے مسٹر قریشی کو بلایا اور کہا کہ جا کر تارا مسیح کی تلاشی لے۔ تھوڑی دیر بعد مسٹر قریشی' بھٹو صاحب کی انگشتری لے کر آ گئے اور بتایا کہ یہ تارا مسیح کی جیب سے نکلی ہے۔

میں نے جیل سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ یہ دونوں چیزیں اپنے پاس رکھیں اور بعد ازاں بیگم بھٹو صاحبہ کے حوالے کر دیں۔ کافی دنوں بعد جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے مجھے باتوں باتوں میں بتایا تھا کہ بھٹو صاحب کا تمام سامان بمع ان کی گھڑی اور انگشتری بھٹو بیگمات کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

بھٹو صاحب کی تدفین:- آدھ گھنٹہ پھانسی پر لٹکائے جانے کے بعد اور جیل ڈاکٹر کے سرٹیفکیٹ پر کہ ان کی موت واقع ہو چکی ہے' بھٹو صاحب کی لاش کو رات دو بج کر پینتیس منٹ پر پھانسی کے پھندے سے جدا کیا

گیا۔ ان کی میت کو غسل دیا گیا جس کا بندوبست وہیں کر لیا گیا تھا۔ ایک فوٹو گرافر نے، جسے ایک انٹیلی جنس ایجنسی نے بھیجا تھا، ضرورت کے مطابق بھٹو صاحب کے چند فوٹو اتارے۔ ان تصویروں سے حکّام کا یہ شک دُور ہو گیا کہ ان کے ختنے نہیں ہوئے، ہوئے تھے۔ بھٹو صاحب کے اسلامی طریقے سے ختنے ہوئے تھے۔ پھر ان کے جسم کو ایک لکڑی کے تابوت میں پھولوں وغیرہ کے ساتھ بند کر دیا گیا اور ان کا تابوت جیل سے تین بج کر پانچ منٹ پر مخصوص گاڑیوں کے ذریعے چکلالہ ایئرپورٹ روانہ ہوا۔ اس سفر پر بھی مجھے بھٹو صاحب کے ساتھ جانا تھا۔ میں ان گاڑیوں کو پی اے ایف چکلالہ لے گیا، جہاں ایک وی آئی پی، سی 130 ہوائی جہاز ہمارے انتظار میں تھا۔ بھٹو صاحب کی میت کے ساتھ 27 پنجاب کی ایک گارد میجر اشفاق کے ماتحت جارہی تھی، جس کو پہلے ہی تیار کر دیا گیا تھا۔ بھٹو صاحب کا تابوت بمع باقی بکسوں وغیرہ کے گاڑیوں سے اتار کر ہوائی جہاز پر لادا گیا اور جہاز جیکب آباد کیلئے محوِ پرواز ہوا۔ جب یہ جہاز سکیسر کے اوپر پرواز کر رہا تھا جو میانوالی کے نزدیک ہے تو جہاز کو فنی خرابی کی وجہ سے اچانک واپس موڑ لیا گیا۔ چونکہ میں ہر چیز کا انچارج تھا اس جہاز کے عملے کا ایک افسر کاک پٹ سے اتر کر میرے پاس آیا اور مجھے بتایا کہ جہاز میں فنی خرابی کی وجہ سے ہم واپس راولپنڈی جا رہے ہیں اور وہاں سے دوسرا جہاز آپ کو جیکب آباد لے جائے گا۔ میں نے اندازہ لگاتے ہوئے ان سے پوچھا کہ کیا جہاز کے انجنوں میں سے کسی انجن میں چنگاری وغیرہ تو نہیں اٹھی۔ وہ صاحب حیران ہوئے اور مجھ سے پوچھا کہ اس کا علم آپ کو کیسے ہوا۔ چونکہ میں ہزاروں گھنٹے سی 130 جہازوں پر سفر کر چکا تھا اور کئی موقعوں پر ایسا تجربہ حاصل ہوا تھا۔ اسی بنا پر میں نے اندازہ لگایا تھا۔ بہر حال اس افسر نے مجھے بتایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ جس انجن میں معمولی شعلہ اٹھا تھا اس کو بند کر دیا گیا ہے اور ہم انشاء اللہ جلد باحفاظت واپس راولپنڈی محفوظ طریقے سے پہنچ جائیں گے۔ ہم واپس چکلالہ ایئر بیس پر بخیریت اترے، ورنہ ہماری قوم کو ایک کبھی نہ حل ہونے والے ہوائی حادثہ سے دوچار ہونا پڑتا اور بے شمار قصے اور افسانے بیان ہوتے رہتے اور آج میں اس بیان کو یوں سچ سچ لکھ کر قوم تک نہ پہنچا سکتا۔

چکلالہ پی اے ایف بیس پر دوسرا سی 130 طیارہ ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ بھٹو صاحب کا تابوت وغیرہ اس میں سوار کر کے ہم نے دوبارہ جیکب آباد کے لئے اڑان شروع کی۔ ہم چار اپریل کی صبح سات بجے سے چند منٹ پہلے جیکب آباد کے ہوائی اڈے پر اترے، جہاں ایک ہیلی کاپٹر انتظار میں تھا۔ ایئر سٹرپ پر ہی 7 پنجاب رجمنٹ کے کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل محمد صادق نے مجھ سے بھٹو صاحب کا تابوت وصول کیا اور ہیلی کاپٹر میں رکھوا کر ساڑھے سات بجے صبح نوڈیرو کیلئے روانہ ہوئے۔ گڑھی خدا بخش میں بھٹو صاحب کی قبر کھودی جا چکی تھی، جس میں انہیں دفنا دیا گیا۔

بھٹو صاحب کی پھانسی کی خبر کو کس طرح مخفی رکھا گیا: جب کبھی بھٹو بیگمات جیل میں بھٹو صاحب سے ملنے آتیں تو عموماً بہت سارے ملکی وغیر ملکی اخبار نویس، ریڈیو اور ٹیلیویژن کے نمائندے جیل کے گیٹ پر

اکٹھے ہو جایا کرتے تھے۔ اسی اثنا میں بی بی سی اور ایک دو دوسری غیر ملکی ٹیلیویژن ٹیمیں جیل کی فلم بنانے بھی آئی تھیں۔ مجھے متنبہ کیا گیا کہ اس قسم کی ٹیلیویژن فلمیں جیل پر ریڈ ر حملہ (Raid) کرنے کیلئے بے حد کار آمد ثابت ہو سکتی ہیں۔ اس لئے ان ٹیلیویژن ٹیموں کو جیل کے نزدیک نہ آنے دیا گیا۔ پاکستان میں اس وقت بی بی سی کا نمائندہ 'مارک ٹیلی بے حد دوڑ دھوپ کر رہا تھا کہ اندر کی خبریں دستیاب ہو سکیں لیکن ہماری انٹیلی جنس اور سیکورٹی خاصی چوکس اور چوکنا کر دی گئی تھیں صرف وہی خبریں میڈیا کو ملتی رہیں جو بھٹو بیگمات اور وکلاء وغیرہ ان کو دیتے رہے۔ بھٹو صاحب کی پھانسی کی خبر کو چھپانے کیلئے جو احتیاطیں اختیار کی گئی تھیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(ا) تین اپریل 1979ء کی صبح کو یہ خبر بیگم بھٹو اور محترمہ بے نظیر کو جیل سپرنٹنڈنٹ نے علیحدگی میں بتائی۔ بھٹو صاحب سے ملاقات کے بعد ان کو کسی اخباری نمائندہ سے نہ ملنے دیا گیا بلکہ ان کو جیل میں لائے جانے والے راستہ کی بجائے دوسرے راستہ سے واپس لے جایا گیا۔ سہالہ ریسٹ ہاؤس کو' جہاں ان کو نظر بند کیا ہوا تھا' باقی دنیا سے پوری طرح الگ تھلگ کر دیا گیا تھا۔ نہ کوئی اندر سے باہر اور نہ باہر سے اندر آ جا سکا۔

(ب) جونہی جیل سٹاف کو بتایا گیا کہ آنے والی رات کو بھٹو صاحب کو پھانسی دی جا رہی ہے تو اس لمحے کے بعد کوئی شخص نہ جیل میں داخل ہونے دیا گیا اور نہ ہی کسی کو باہر نکلنے دیا گیا۔ اسی لمحے جیل کے گیٹ پر فوجی پہرہ لگا دیا گیا۔

(ج) جیل کے تمام راستے بند کر دیئے گئے۔ ٹیلیفون کے تمام رابطے منقطع کر دیئے گئے تاکہ کوئی بھی یہ خبر باہر نہ بتا سکے۔ صرف 27 پنجاب کا ٹیلیفون اور وائرلیس کا رابطہ بحال رکھا گیا اس ٹیلیفون پر بھی ڈیوٹی افسر تعینات کر دیا گیا تاکہ کوئی غیر ضروری کال نہ کی جا سکے اور نہ ہی سنی جا سکے۔

(د) بھٹو صاحب کو پھانسی لگ جانے کے بعد ڈی آئی جی جیل خانہ جات واپس اپنی رہائش گاہ کو جانا چاہتے تھے مگر گیٹ پر فوجی سنتری نے ان کو باہر نہ جانے دیا۔ وہ میرے پاس واپس آئے اور کہنے لگے 'یہ بھی ایک ریکارڈ رہے گا کہ ڈی آئی جی جیل خانہ جات کو سنتری نے جیل کے گیٹ پر روکا ہی نہ ہو بلکہ گزرنے تک نہ دیا ہو۔ بہر حال ان کی بزرگی اور رتبہ کو محسوس کرتے ہوئے میں نے معذرت چاہی اور جیل سے ان کے باہر جانے کا بندوبست کیا لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے جائے رہائش پر پہنچ کر اپنی بیگم سے ٹیلیفون کے ذریعے لاہور بات چیت کی اور انہیں بتایا کہ بھٹو صاحب کو پھانسی لگا دی گئی ہے۔ یہ خبر اسی وقت کسی دوسرے سینئر آفیشل کو ان کی بیگم صاحبہ نے بتا دی اور پھر وہی ہوا جو ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ یہ خبر لاہور سے بارڈر پاس ہوئی اور دنیا کو سب سے پہلے بھٹو صاحب کی پھانسی کی خبر آل انڈیا ریڈیو نے مورخہ 4 اپریل 1979ء صبح سات بجے سنائی۔

(ر) رات 3/4 اپریل 1979ء اخباری نمائندے پوری بھاگ دوڑ کر رہے تھے کہ صحیح خبر معلوم

ہو سکے۔ بیچارے دورپورٹرا پنے موٹر سائیکلوں پر جیل کے ارد گرد چکر لگاتے ہوئے رات کی پٹرول پارٹی نے گر فتار کر لئے۔ ان کو 27 پنجاب کے کیمپ میں بمع ان کے موٹر سائیکل بند کر دیا گیااور اگلی صبح کافی دیر بعد انہیں چھوڑا گیا۔ میں ان صاحبان سے معذرت خواہ ہوں۔

(س) مجھے بعد میں پتہ چلا کہ مارشل لاء حکام نے بھٹو صاحب کی پھانسی کی خبر پوشیدہ رکھنے کیلئے ڈی سی اور کمشنر راولپنڈی کو بھی بروقت اور پوری پوری اطلاع نہ دی تھی۔

(ص) بھٹو بیگمات کی آخری ملاقات کے بعد بھٹو صاحب کے وہ رشتہ دار جو راولپنڈی میں حاضر تھے ان کو بھٹو صاحب کے ساتھ آخری ملاقات نہ کروانے کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان ملاقاتوں کے بعد یہ خبر مخفی نہ رکھی جا سکے گی۔

حکام مندرجہ بالا احتیاطوں کے باعث بھٹو صاحب کی پھانسی کی خبر راز میں رکھنے میں بہت حد تک کامیاب رہے تھے۔

3 اپریل 1979ء کو آخری ملاقات کے بعد بیگم بھٹو اور محترمہ بے نظیر جب مجھ سے جیل میں ملیں کہ بیگم صاحبہ صدر پاکستان سے اپنی ذاتی اپیل کرنا چاہتی ہیں اور میں ان کی اس سلسلے میں مدد کروں' اسی دوران ان بیگمات نے مجھے بتایا تھا کہ بھٹو صاحب لاڑکانہ میں دفن ہونا چاہیں گے۔ 5 اپریل مجھے ایس ایم ایل اے نے کہا تھا کہ بھٹو بیگمات کو ایک دو دنوں میں نوڈیرو لے جایا جائے گا اور مجھے ان کے ہمراہ جانا ہو گا۔ میں نے سوچا کہ بیگمات کے ساتھ اس سفر کے دوران میں انہیں آخری لمحات کے متعلق بتا سکوں گا لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر مجھے بھٹو بیگمات کے ساتھ نہ بھیجا گیا اور میں ان کو بھٹو صاحب کے آخری لمحات کے متعلق ، جس کے لئے وہ بے حد مضطرب رہی ہوں گی ' نہ بتا سکا۔

میرے جنرل محمد ضیاءالحق صاحب کے ساتھ تعلقات

مجھے جنرل محمد ضیاءالحق صاحب کے ساتھ کام کرنے کا کبھی موقع نہ ملا تھا۔ میں نے پہلی مرتبہ ان کو اس وقت دیکھا جب وہ پاکستان فوج کے چیف آف سٹاف مقرر ہوئے اور انہوں نے فوج کی کمان سنبھالنے پر سکول آف انفینٹری اینڈ ٹیکٹکس کوئٹہ کا پہلا دورہ کیا' جہاں میں چیف انسٹرکٹر کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس موقع پر بھی بات ان سے مصافحے یا چائے کے میز پر آمنے سامنے اور علیک سلیک سے آگے نہ بڑھی۔

نومبر 1977ء میں میری تبدیلی انفینٹری سکول کوئٹہ سے 27 پنجاب رجمنٹ راولپنڈی میں ہوئی۔ یہ پلٹن 111 بریگیڈ کا حصہ تھی۔ اس بریگیڈ کی آپریشنل ذمہ داری تو کہیں اور تھی لیکن ان دنوں اس کا کام دارالحکومت اسلام آباد، راولپنڈی کا علاقہ بمع پریذیڈنسی کی حفاظت تھا۔ مارشل لاء کے نفاذ کی وجہ سے یہ بریگیڈ اہم ذمہ داری پر مامور تھا۔ 1978ء کے رمضان کے مہینے میں تینوں کمانڈنگ افسران اور وہ جوان جو صدر صاحب کی حفاظت کے ذمہ دار تھے' کو آرمی ہاؤس جہاں صدر صاحب رہ رہے تھے میں افطار پر مدعو کیا گیا۔

افطاری اور مغرب کی نماز کے بعد ہم سب کھانے کی میز پر آئے۔ جنرل محمد ضیاءالحق صاحب آکر میری کرسی کی ساتھ والی نشست پر تشریف فرما ہوئے۔ دراصل اس دعوت پر جانے سے پہلے میں نے سوچا تھا کہ اگر مجھے صدر صاحب کے ساتھ اس قدر نزدیک بیٹھ کر ایک' آدھ گھنٹہ کھانے پر گزارنا پڑا تو میں ان

کریں گے ہم اس عظیم مقصد کو حاصل نہ کر پائیں گے۔ ان کی تفصیل سننے کے بعد میں نے ان سے پوچھا کہ جناب اسلامی نظام کو رائج کرنے میں ان کے خیال میں کتنا وقت درکار ہو گا؟ چونکہ جنرل ضیاء صاحب کو مارشل لاء لگائے ہوئے اور پھر اسلامی نظام رائج کرنے کے متعلق بیانات دیتے ہوئے کافی وقت گزر چکا تھا۔ ادھر ہر محبِ وطن یہی چاہتا تھا کہ وعدہ کے مطابق الیکشن جلد از جلد ہوں اور اگر نظامِ مصطفیٰؐ کا بھی آغاز ہو جائے تو کیا بات! جنرل صاحب نے جواباً فرمایا کہ اس نظام کو رائج کرنے میں انہیں کچھ وقت درکار ہو گا۔ میں اس رات جنرل صاحب کے ساتھ اپنے پورے اعتقاد اور یقین کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ جناب اگر آپ نے اپنی پوری طاقت اور ایمان کے ساتھ اس کام کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچایا تو اسلامی نظام بھی ڈیموکریسی' ڈکٹیٹر شپ اور سوشل ازم جو بالترتیب قائدِاعظمؒ' فیلڈ مارشل اور بھٹو صاحب کے بعد فیل ہو گئے تھے 'ناکام کہا جائیگا' میں نے ان سے دے کر کہا کہ اگر اسلامی نظام بھی بے دلی سے محض سیاسی نعرہ بازی کے طور پر رائج کرنے کی کوشش کی گئی تو خدانہ کرے' دنیا کہے گی کہ یہ بھی دوسرے نظاموں کی طرح اپنی افادیت کھو چکا ہے اور پھر کمیونزم اور لادینیت کو کوئی روک نہ سکے گا۔ انہوں نے مجھے پھر بڑے غور سے دیکھا اور چند لمحوں بعد اپنے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا' رفیع فکر نہ کیجئے' ایسا ہرگز نہ ہو گا۔

چونکہ مجھے ہمارے بنکوں کا سودی نظام کے بغیر چلنا ناممکن نظر آتا تھا اس لئے میں نے لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد جنرل صاحب سے پوچھا کہ جناب آپ کی حکومت اسلامی طریقہ سے بینکنگ کو کس طرح چلانے کا سوچ رہی ہے۔ انہوں نے جواب میں کہا' کچھ دن انتظار کیجئے' ماہرین اس کام پر لگے ہوئے ہیں اور جلد بنکوں سے سودی نظام ختم کر دیا جائے گا۔

گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے میں نے ان سے پوچھا کہ جناب آپ ایک سپاہی سے سیاستدان بن کر کیسے محسوس کر رہے ہیں۔ انہوں نے پھر مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ رفیع صاحب یہ ایک بہت بڑا تجربہ ہے اور کہنے لگے' میں ملک و قوم کیلئے کتنا ہی اچھا پلان سوچوں لیکن ہمارے سیاست دان اس کی ضرور مخالفت کرتے ہیں اور بدقسمتی یہ ہے کہ کوئی بھی اس کے بجائے اپنا صحیح حل نہیں بتاتا بلکہ صرف مخالفت برائے مخالفت ہی کیئے جاتے ہیں۔ پھر کہنے لگے کہ سیاسی اور فوجی سوچ میں یہی بڑا فرق ہے۔ میں نے جواب میں کہا کہ جناب آپ بہت جلد ان کی سیاست بھی سمجھنے لگیں گے' جس پر وہ ہنس پڑے اور فرمایا' ہاں کوشش تو کر رہا ہوں۔

میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے بھٹو صاحب کے متعلق یا جیل کے حالات پر کچھ گفتگو ضرور کریں گے لیکن انہوں نے اس طرف کوئی اشارہ تک نہ کیا بلکہ بعد میں بھی میری جیل میں تعیناتی کے دوران انہوں نے اس موضوع پر کبھی اشارتاً بھی بات چیت نہ کی' اور مجھے شک ہونے لگا کہ انہیں میری جیل کی ذمہ داریوں کا علم بھی ہے یا نہیں' حتیٰ کہ 1978ء کی دوسری عید کے موقع پر جب میں آرمی ہاؤس ان سے عید ملنے گیا

تو جنرل ضیاء صاحب نے مجھے گلے لگاتے ہوئے میرے کان میں آہستہ سے فرمایا، رفیع صاحب کیا حال ہیں آپ کے؟ تب مجھے یقین ہوا کہ وہ مجھے اچھی طرح سے جانتے ہیں۔

افطار ڈنر کے بعد دوسرے کمانڈنگ افسران کے ساتھ میں نے بھی اجازت لی، جنرل صاحب نے میرے ساتھ بڑی گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔ میرے گھر پہنچنے کے تیس، چالیس منٹ بعد مجھے صدر صاحب کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر ظفر (مرحوم) نے ٹیلیفون کیا اور بتایا کہ صدر ضیاء الحق صاحب دو دنوں میں عمرہ ادا کرنے سعودی عرب تشریف لے جا رہے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ آپ (کرنل رفیع الدین) بھی ان کے ساتھ جائیں، اس لئے مجھے انہوں نے کہا کہ میں اپنا پاسپورٹ اگلی صبح فارن آفس اسلام آباد پہنچادوں۔

میں صدر صاحب کی خاص فلائٹ میں ان کے ساتھ مکّہ معظمہ گیا۔ ہم نے ایک دن اور ایک رات مکّہ معظمہ میں گزاری اور دو دن اور ایک رات مدینہ منورہ میں رہے جہاں ہم لوگ سعودی شاہی مہمان تھے، لیکن شام کے کھانے اور سحری کے علاوہ ہم لوگوں نے پورا وقت حرم شریف اور مسجدِ نبوی میں گزارا۔ میں نے جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کو ساری ساری رات نوافل ادا کرتے یا تلاوت میں مشغول دیکھا۔ ان کی اس لگن نے میرے دل میں ان کے لئے بے حد عقیدت واحترام پیدا کر دیا۔ اس سفر کے دوران میرا جنرل صاحب کے ساتھ کئی مرتبہ آمنا سامنا ہوا لیکن سوائے "السلامُ وعلیکم" یا تعظیم بجا آوری کے کوئی خاص بات چیت نہ ہوئی۔ واپس آنے کے بعد اگر میں راولپنڈی میں موجود ہوتا تو ہر عید پر جنرل صاحب سے عید ملتا رہا، وہ مجھے ایسے مواقع پر بڑے تپاک سے ملا کرتے تھے۔

بھٹو صاحب کی پھانسی کے بعد میری پلٹن واپس چھاؤنی میں منتقل کر دی گئی۔ چند ہفتوں بعد مجھے ملٹری سیکرٹری نے جی ایچ کیو بلا بھیجا۔ ملاقات کے دوران انہوں نے مجھے بتایا کہ انٹیلی جنس رپورٹوں کے مطابق میری زندگی کو خطرہ لاحق ہے اور صدر صاحب نے انہیں حکم دیا کہ مجھے باہر کسی ملک میں ملٹری اتاشی بنا کر بھیج دیا جائے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ان فرائض کیلئے مجھے ملک سے باہر جانے کی تیاری کر لینی چاہئے۔

کچھ دنوں بعد میری تبدیلی دوبارہ انفنٹری سکول کوئٹہ کر دی گئی، جہاں 1980ء کے آخری ایّام میں ایک ضیافت کے دوران میرا اور جنرل ضیاء الحق صاحب کا آمنا سامنا ہوا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کرنل رفیع تم ابھی تک یہاں ہی ہو۔ میں نے انہیں بتایا کہ مجھے باہر بھیجنے کے احکام صادر کئے گئے تھے لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر ابھی تک ان پر عمل نہیں ہوا۔ جنرل صاحب نے اپنے ملٹری سیکرٹری کو کچھ ہدایات دیں اور مجھے آخر کار 1981ء کے اکتوبر میں جکارتہ ایمبیسی میں ڈیفنس اتاشی مقرر کر دیا گیا۔

جنرل ضیاء الحق صاحب نے 1982ء کے آخری دنوں میں انڈونیشیا اور ملائیشیا کا سرکاری دورہ کیا۔ آمد پر وہ مجھے اور میری بیگم سے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ ملے۔ ان کے دورے کے دوران میں نے انہیں انڈونیشیا، ملائیشیا، سنگاپور اور برونائی پر بریفنگ دی اور ان کا فوجی لحاظ سے دورے کا اہتمام کیا، جس

پر وہ بہت خوش ہوئے۔ اس دورے کے دوران میں نے ان کے ساتھ اچھا خاصا وقت الگ تھلگ بھی گزارا۔ چونکہ وہ رات گئے زیادہ کام کرتے تھے اس لئے میں نے ان کے ساتھ کئی گھنٹے گزارے اور انہیں خاص کر انڈونیشیا کے فوجی نظامِ حکومت پر بریف کیا اور ان کے کئی شکوک کے جواب مہیا کئے۔ اس دورے کے دوران بھی انہوں نے سوائے سرکاری کام کے کسی دوسرے پہلو پر مجھ سے کوئی بات چیت نہ کی۔

میں اکتوبر 1984ء میں واپس پاکستان آ گیا۔ شاید میرے ایس ایس جی اور انٹیلی جنس کے لمبے تجربے کی بنا پر مجھے آئی ایس آئی اسلام آباد میں ایک خاص کام سونپا گیا۔ ان فرائض کے دوران مجھے صدر جناب ضیاء الحق صاحب کے ساتھ کئی مرتبہ ملاقات کا موقع ملا۔ چونکہ ہمارے کام کی نوعیت قومی لحاظ سے بہت اہم تھی اس لئے عموماً دو، تین ماہ میں صدر صاحب تقریباً ایک دن صبح سے شام تک آئی ایس آئی کے اس محکمے میں گزارا کرتے تھے، جہاں ظہر اور کئی مرتبہ عصر کی نمازیں بھی پڑھ کر جایا کرتے تھے۔ ایسے موقعوں پر صدر صاحب کو متعلقہ افسران آئی ایس آئی کی کارکردگی پر بریفنگ دیا کرتے تھے اور آئندہ کے پلان پر بھی بحث ہوا کرتی تھی۔ ان دنوں مجھے کئی غیر ملکی اہم شخصیات کے ساتھ صدر صاحب کی ملاقاتوں کا بھی بندوبست کرنا پڑتا تھا، جن میں فارن آفس اور پروٹوکول وغیرہ کا کوئی عمل دخل نہ ہوتا تھا، بلکہ ان دفاتر کو ایسی ملاقاتوں کا علم تک نہ ہوتا تھا۔ اس دورانئے میں مجھے دنیا کی سب سے زبردست اور نہ دکھائی دینے والی حکومت کے سربراہ سے لمبی ملاقاتوں کا بھی موقع ملا۔ ان چند سالوں کے دوران میری جنرل ضیاء الحق صاحب کے ساتھ کبھی کوئی نجی بات چیت نہ ہوئی بلکہ ہماری گفتگو ہمیشہ صرف قومی ذمہ داریوں تک محدود رہی۔

1987ء کے آخری ایّام میں، مَیں نے صدر صاحب کے ملٹری سیکرٹری کو کہہ کر ان سے ملاقات کا وقت لیا، جس کے دوران میں نے انہیں بتایا کہ میرے کچھ دوست مجھے مشورہ دے رہے ہیں کہ مجھے اپنی یادداشتیں لکھنی چاہئیں۔۔ جنرل ضیاء الحق صاحب جو میرے ساتھ بڑے اچھے موڈ میں بات چیت کر رہے تھے میری یہ بات سنتے ہی فوراً غصے میں آ گئے اور مجھے کہا کرنل رفیع، بھٹو کو مرے ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں اور لوگ اسے بھول چکے ہیں، حتیٰ کہ اس کے اپنے رشتہ دار بھی اسے بھولنے والے ہیں۔ مجھے انہوں نے سخت لہجے میں تنبیہ کی کہ مجھے عقل سے کام لینا چاہئے۔ اس لمحہ وہ ایک مسکراتے جنرل نہ تھے بلکہ کم از کم میں نے انہیں کبھی ایسی حالت میں نہ دیکھا تھا اور نہ سنا تھا۔ وہ ملاقاتی کمرے میں اپنی کرسی سے اسی موڈ میں اٹھ کھڑے ہوئے اور میں نے بھی اٹھ کر ان سے ہاتھ ملایا۔ جونہی میں نے دو چار قدم باہر نکلنے کیلئے لئے تو انہوں نے مجھے بلاتے ہوئے کہا، کرنل رفیع اگر تمہیں کبھی بھی کوئی پرابلم ہو تو ضرور میرے نوٹس میں لانا اور نصیحت کے طور پر فرمایا کہ مَیں اپنے دماغ کو ٹھنڈا اور مطمئن رکھوں اور مردوں کو قبر سے نکالنے کی کوشش نہ کروں۔ میں اپنی کوتاہ اندیشی پر نادم اور خاموش ہو گیا اور بھاری قدموں سے ایوان صدر سے

واپس آ گیا۔

مارچ 1988ء میں، مَیں نے بیٹے کی شادی کے موقع پر صدر جنرل ضیاءالحق صاحب کو دعوتِ ولیمہ کا کارڈ ایک خط کے ساتھ بھیجا۔ مجھے اطلاع دی گئی کہ صدر صاحب کی بیگم صاحبہ علاج کیلئے ملک سے باہر گئی ہوئی ہیں البتہ جناب صدر اس موقع کو رونق بخشیں گے۔ ولیمہ پر صدر صاحب پرل کانٹی نینٹل راولپنڈی تشریف لائے۔ وہ اس شام بے حد ہشاش بشاش تھے اور مجھے بتایا کہ ایک اہم امریکی ڈیلی گیشن نے ان کو ملنا تھا لیکن میرے بیٹے کی شادی بھی ان کے لئے کوئی کم ضروری نہ تھی۔ انہوں نے دولہا اور دلہن کو تحائف سے نوازا اور کافی دیر پارٹی کو رونق بخشی۔ جاتے وقت میرے شکریئے کے بعد انہوں نے مجھے بمع بیگم اور ہمارے بیٹے ڈاکٹر ناصر رفیع اور بہو رباب ناصر کو ایوانِ صدر چائے پر مدعو کیا۔ چونکہ بیگم ضیاءالحق صاحبہ نے علاج کیلئے ملک سے باہر کافی عرصہ گزار دیا اس لئے ہم اس ضیافت کیلئے نہ جا سکے۔ اور پرل کانٹی نینٹل میں میری جنرل ضیاءالحق صاحب کے ساتھ ملاقات آخری ثابت ہوئی۔

راولپنڈی جیل میں بھٹو صاحب کے ساتھ ملاقاتوں کا ریکارڈ

بھٹو صاحب کو 17 مئی 1978ء کی صبح کوٹ لکھپت جیل، لاہور سے سنٹرل جیل راولپنڈی لایا گیا۔ چار اپریل 1979ء ان کو پھانسی دی جانے تک اسی جیل میں رکھا گیا۔ اس دوران ان سے ملنے والوں کا مکمل ریکارڈ درج ذیل ہے۔ اس ریکارڈ میں میرے اور جیل حکام کے علاوہ جو بھی ان سے ملا، سیکورٹی وارڈ میں ان کے سیل تک گیا۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نمبر شمار	تاریخ	نام ملاقاتی	سیل میں داخلے کا وقت	سیل سے نکلنے کا وقت	کیفیت
1	19 مئی 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	11 بجکر 20 منٹ	1 بجکر 5 منٹ بعد دوپہر	بھٹو صاب کے ایک وکیل
2	20 مئی 78ء	مسٹر یحیٰ بختیار	2 بجکر 35 منٹ	3 بجکر 50 منٹ	
		مسٹر غلام علی میمن	بعد دوپہر	بعد دوپہر	بھٹو صاحب کے وکلاء
		مسٹر دوست محمد اعوان	"	"	
3	21 مئی 78ء	بیگم نصرت بھٹو	9 بجکر 35 منٹ	12 بجکر 35 منٹ	پنڈی جیل میں پہلی ملاقات
4	21 مئی 78ء	مسٹر غلام علی میمن	2 بجکر 35 منٹ	3 بجکر 40 منٹ	
		مسٹر دوست محمد اعوان	بعد دوپہر		

5	22 مئی 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار	2 بجکر 10 منٹ	3 بجکر 15 منٹ	
		مسٹر غلام علی میمن	بعد دوپہر		
6	24 مئی 78ء	مس بے نظیر صاحبہ	9 بجکر 30 منٹ	12 بجکر 15 منٹ	پنڈی جیل میں پہلی ملاقات
7	24 مئی 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار	1 بجکر 35 منٹ	2 بجکر 50 منٹ	
		مسٹر دوست محمد اعوان	بعد دوپہر	بعد دوپہر	
		مسٹر غلام علی میمن	"	"	
8	25 مئی 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	12 بجکر 40 منٹ	1 بجکر 20 منٹ	
			بعد دوپہر	بعد دوپہر	
9	27 مئی 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار	1 بجکر 45 منٹ	3 بجکر 15 منٹ	
		مسٹر دوست محمد اعوان	بعد دوپہر	بعد دوپہر	
		مسٹر غلام علی میمن			
10	28 مئی 78ء	بیگم نصرت بھٹو	9 بجکر 40 منٹ	12 بجکر 15 منٹ	
11	29 مئی 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار	2 بجکر 20 منٹ	3 بجکر 35 منٹ	وکلاء بھٹو صاحب کیلئے قیمہ پلاؤ مرغ روسٹ، نان، سلاد اور آئس کریم لائے
		مسٹر غلام علی میمن	بعد دوپہر	بعد دوپہر	
12	30 مئی 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار	ایک بجے	ایک بجکر 35 منٹ	
		مسٹر دوست محمد اعوان	بعد دوپہر	بعد دوپہر	

13	31 مئی 78ء	مسٹر غلام علی میمن	ایک بجکر 30 منٹ بعد دوپہر	4 بجے بعد دوپہر
14	یکم جون 78ء	مسٹر غلام علی میمن	2 بجے بعد دوپہر	3 بجے بعد دوپہر
15	2 جون 78ء	مس بے نظیر بھٹو	12 بجکر 30 منٹ بعد دوپہر	3 بجے بعد دوپہر
16	3 جون 78ء	مسٹر یحیٰی بختیار	2 بجے	3 بجکر 45 منٹ
		مسٹر غلام علی میمن	بعد دوپہر	بعد دوپہر
17	4 جون 78ء	مسٹر یحیٰی بختیار	2 بجے	3 بجکر 25 منٹ
		مسٹر دوست محمد اعوان	بعد دوپہر	بعد دوپہر
18	5 جون 78ء	مسٹر یحیٰی بختیار	2 بجکر 5 منٹ	3 بجکر 10 منٹ
		مسٹر دوست محمد اعوان	بعد دوپہر	بعد دوپہر
19	6 جون 78ء	مسٹر یحیٰی بختیار	ایک بجکر 49 منٹ	3 بجکر 25 منٹ
		مسٹر دوست محمد اعوان	بعد دوپہر	بعد دوپہر
20	7 جون 78ء	مسٹر یحیٰی بختیار	2 بجے	3 بجکر 15 منٹ
		مسٹر دوست محمد اعوان	2 بجکر 35 منٹ	〃
21	8 جون 78ء	مسٹر یحیٰی بختیار	7 بجے شام	8 بجکر 15 منٹ
		مسٹر غلام علی میمن		شام
22	9 جون 78ء	بیگم نصرت بھٹو	9 بجکر 35 منٹ	12 بجکر 40 منٹ

23	10جون 78ء	مسٹر یحیٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	7 بجے شام	8بجکر 25منٹ	وکلاء شام کا کھانا ساتھ لائے
24	11جون 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	7بجکر 15منٹ شام	8بجکر 20منٹ شام	
25	12جون 78ء	مسٹر غلام علی میمن			
26	14جون 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان مسٹر حفیظ لاکھو	7بجے	8 بجے شام	لاکھو صاحب پہلی مرتبہ آئے
27	14جون 78ء	جیل ڈاکٹر	9بجکر 30منٹ	10بجکر 10منٹ	بھٹو صاحب کے کہنے پر جیل ڈاکٹر کو اندر بھیجا گیا۔
28	15جون 78ء	مس بے نظیر بھٹو	10بجکر 45منٹ	ایک بجکر 45منٹ بعد دوپہر	
29	15جون 78ء	لیفٹیننٹ جنرل ڈاکٹر شوکت حسن	6بجے شام	6بجکر 45منٹ	بھٹو صاحب کے معائنہ کیلئے آئے۔ میرے علاوہ پہلے فوجی افسر جو سیل میں داخل ہوئے۔
30	15جون 78ء	مسٹر غلام علی میمن مسٹر حفیظ لاکھو	6بجکر 55منٹ شام	8 بجے شام	
31	17جون 78ء	مسٹر غلام علی میمن مسٹر حفیظ لاکھو	7 بجے شام	8بجکر 10منٹ	انہی وکلاء نے دن 2 بجے مرغ روسٹ 'پکوڑے' آئس کریم اور آم بھٹو صاحب کیلئے بھیجے۔

32	18 جون 78ء	محترمہ امیر بیگم بھٹو	11 بجکر 50 منٹ	3 بجکر 5 منٹ	بھٹو صاحب کی پہلی بیگم۔ وہ ایک 'ایک دیگچی حلوہ اور پنیری بھٹو صاحب کیلئے لائیں۔
33	18 جون 78ء	مسٹر حفیظ لاکھو	7 بجکر 10 منٹ	8 بجکر 5 منٹ شام	
34	19 جون 78ء	مسٹر حفیظ لاکھو	7 بجکر 15 منٹ	8 بجکر 5 منٹ شام	
35	20 جون 78ء	مسٹر حفیظ لاکھو	7 بجے شام	8 بجے شام	
		مسٹر دوست محمد اعوان	〃	〃	
36	21 جون 78ء	مس بے نظیر بھٹو	4 بجکر 5 منٹ	9 بجکر 22 منٹ	مس بے نظیر صاحبہ کا برتھ ڈے
37	〃	بیگم نصرت بھٹو	6 بجکر 35 منٹ	9 بجکر 20 منٹ	
38	22 جون 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	7 بجے شام	8 بجے شام	
		مسٹر حفیظ لاکھو	〃	〃	〃 〃
39	23 جون 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	7 بجکر 20 منٹ	8 بجکر 36 منٹ شام	
		مسٹر حفیظ لاکھو			
40	25 جون 78ء	مسٹر عبدالحفیظ لاکھو	7 بجے شام	8 بجے شام	
		مسٹر غلام علی میمن	〃	〃	
41	26 جون 78ء	مسٹر عبدالحفیظ لاکھو	7 بجے شام	8 بجکر 5 منٹ شام	
		مسٹر غلام علی میمن			

42	27 جون 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	7 بجے شام	8 بجے شام	
43	28 جون 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	7 بجے شام	8 بجکر 26 منٹ شام	
44	29 جون 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	7 بجے شام	8 بجے شام	
45	یکم جولائی 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر دوست محمد اعوان	7 بجے شام	8 بجکر 15 منٹ شام	
46	2 جولائی 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر دوست محمد اعوان	7 بجے شام	8 بجے شام	وکلاء بھٹو صاحب کیلئے شام کا کھانا بھی لائے
47	3 جولائی 78ء	مسٹر غلام علی میمن مسٹر عبدالحفیظ لاکھو	7 بجے شام	8 بجے شام	
48	4 جولائی 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان مسٹر غلام علی میمن	7 بجے شام	8 بجکر 35 منٹ شام	
49	5 جولائی 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	7 بجے شام	8 بجکر 10 منٹ	

50	6جولائی 78ء	مسٹرغلام علی میمن	7بجے شام	8بجے شام
		مسٹردوست محمد اعوان		
51	8جولائی 78ء	بیگم نصرت بھٹو	10بجکر 45منٹ	ایک بجکر 45منٹ
52	8جولائی 78ء	مسٹردوست محمد اعوان	7بجے شام	8بجکر 15منٹ شام
		مسٹرغلام علی میمن		
53	9جولائی 78ء	مس بے نظیر بھٹو	11بجکر 30منٹ	2بجکر 30منٹ
54	9جولائی 78ء	مسٹریحیٰ بختیار	7بجکر 10منٹ شام	8بجکر 10منٹ شام
		مسٹرغلام علی میمن		
55	10جولائی 78ء	مسٹریحیٰ بختیار	7بجکر 10منٹ	8بجکر 25منٹ شام
		مسٹردوست محمد اعوان		
56	11جولائی 78ء	مسٹردوست محمد اعوان	7بجے شام	8بجکر 30منٹ
		مسٹرعبدالحفیظ لاکھو		
57	12جولائی 78ء	مسٹریحیٰ بختیار		
		مسٹرغلام علی میمن	7بجکر 5منٹ	8بجکر 10منٹ شام
58	13جولائی 78ء	مسٹریحیٰ بختیار		
		مسٹردوست محمد اعوان	7بجکر 5منٹ	8بجکر 25منٹ شام

59	15جولائی 78ء	مس بے نظیر بھٹو	ایک بجے دن	3بجکر 20منٹ
60	15جولائی 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	7بجے شام	8بجکر 5منٹ
61	16جولائی 78ء	بیگم نصرت بھٹو	3بجکر 15منٹ	6بجے شام
62	16جولائی 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر دوست محمد اعوان	7بجے شام	8بجے شام
63	17جولائی 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان مسٹر غلام علی میمن	7بجے شام	8بجکر 5منٹ شام
64	18جولائی 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	7بجے شام	8بجے شام
65	19جولائی 78ء	جیل ڈاکٹر	ایک بجکر 20منٹ	ایک بجکر 30منٹ دوپہر
66	19جولائی 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان مسٹر غلام علی میمن	7بجے شام	8بجکر 5منٹ شام
67	20جولائی 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	7بجے شام	8بجکر 15منٹ شام
68	22جولائی 78ء	مس بے نظیر بھٹو	12بجے دوپہر	2بجے بعد دوپہر
69	22جولائی 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	7بجے شام	8بجے شام

		مسٹر غلام علی میمن		
70	23 جولائی 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان مسٹر غلام علی میمن	7 بجے شام	8 بجے شام
71	24 جولائی 78ء	بیگم نصرت بھٹو	11 بجے دن	ایک بجکر 15 منٹ بعد دوپہر
72	24 جولائی 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	7 بجے شام	8 بجے شام
73	25 جولائی 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان مسٹر غلام علی میمن	7 بجے شام	8 بجکر 20 منٹ شام
74	26 جولائی 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	7 بجکر 5 منٹ شام	8 بجکر 10 منٹ شام
75	27 جولائی 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان مسٹر غلام علی میمن	7 بجکر 3 منٹ شام	8 بجکر 12 منٹ شام
76	29 جولائی 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	7 بجکر 5 منٹ شام	8 بجکر 5 منٹ شام
77	30 جولائی 78ء	مس بے نظیر بھٹو	12 بجکر 7 منٹ	2 بجکر 30 منٹ بعد دوپہر
78	30 جولائی 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	7 بجے شام	8 بجکر 20 منٹ شام

79	31 جولائی 78ء	بیگم نصرت بھٹو	12 بجکر 20 منٹ	2 بجکر 50 منٹ	
80	31 جولائی 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	7 بجکر 10 منٹ	8 بجکر 5 منٹ شام	
81	یکم اگست 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	7 بجکر 5 منٹ	8 بجکر 10 منٹ شام	
82	2 اگست 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	7 بجے شام	8 بجکر 8 منٹ شام	
83	3 اگست 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان مسٹر غلام علی میمن	7 بجکر 5 منٹ	8 بجکر 10 منٹ شام	
84	4 اگست 78ء	ڈاکٹر اقبال ڈاکٹر حفیظ اختر ڈاکٹر اسلم ارشد ڈاکٹر صدیق	12 بجکر 30 منٹ	ایک بجکر 40 منٹ بعد دوپہر	ڈاکٹر صاحبان بھٹو صاحب کی میڈیکل چیک اپ کے لئے بلوائے گئے
85	5 اگست 78ء	مس بے نظیر بھٹو	12 بجکر 5 منٹ	2 بجکر 20 منٹ بعد دوپہر	
86	5 اگست 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر عبدالحفیظ لاکھو	7 بجکر 15 منٹ	8 بجکر 15 منٹ شام	

87	6اگست 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان مسٹر عبدالحفیظ لاکھو	7بجکر 5منٹ	8بجکر 10منٹ شام	
88	7اگست 78ء	ایک ڈاکٹر سول ہسپتال راولپنڈی	ایک بجکر 40منٹ	ایک بجکر 50منٹ بعد دوپہر	ڈاکٹر بھٹو صاحب کو چیک اپ کیلئے آیا
89	7اگست 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر لام علی میمن	7بجکر 30منٹ	8بجکر 35منٹ شام	
90	8اگست 78ء	بیگم نصرت بھٹو	11بجکر 20منٹ	2بجکر 20منٹ	
91	8اگست 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان مسٹر غلام علی میمن	7بجکر 30منٹ	8بجکر 35منٹ شام	
92	9اگست 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار، مسٹر غلام علی میمن	7بجکر 40منٹ	8بجکر 55منٹ شام	
93	10اگست 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان مسٹر غلام علی میمن	7بجکر 30منٹ	8بجکر 45منٹ شام	
94	12اگست 78ء	مس بے نظیر بھٹو	12بجکر 15منٹ	2بجکر 15منٹ بعد دوپہر	
95	12اگست 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	7بجکر 30منٹ	8بجکر 45منٹ شام	
96	13اگست 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	7بجکر 30منٹ	8بجکر 45منٹ	

		مسٹر عبدالحفیظ لاکھو		شام
97	14 اگست 78ء	بیگم نصرت بھٹو	11 بجکر 45 منٹ	3 بجے بعد دوپہر
98	15 اگست 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار	7 بجکر 30 منٹ	8 بجکر 35 منٹ
		مسٹر غلام علی میمن		شام
99	16 اگست 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	7 بجکر 35 منٹ	8 بجکر 55 منٹ
		مسٹر عبدالحفیظ لاکھو		شام
100	17 اگست 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار	7 بجکر 30 منٹ	8 بجکر 40 منٹ
		مسٹر غلام علی میمن		
101	18 اگست 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار	7 بجکر 10 منٹ	7 بجکر 40 منٹ
		مسٹر غلام علی میمن		شام
102	19 اگست 78ء	مس بے نظیر بھٹو	12 بجکر 20 منٹ	2 بجکر 40 منٹ بعد دوپہر
103	19 اگست 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	7 بجکر 30 منٹ	8 بجکر 45 منٹ
		مسٹر عبدالحفیظ لاکھو		
104	20 اگست 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار		
		مسٹر غلام علی میمن	7 بجکر 30 منٹ	8 بجکر 30 منٹ شام
105	21 اگست 78ء	بیگم نصرت بھٹو	12 بجے دوپہر	3 بجے بعد دوپہر

106	21 اگست 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان مسٹر غلام علی میمن	7 بجکر 35 منٹ	8 بجکر 25 منٹ شام	
107	22 اگست 78ء	ڈاکٹر محمد اسلم	11 بجکر 15 منٹ	12 بجکر 15 منٹ	
108	22 اگست 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	6 بجکر 25 منٹ	8 بجے شام	
109	23 اگست 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان مسٹر عبدالحفیظ لاکھو	6 بجکر 35 منٹ	8 بجے شام	
110	24 اگست 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	6 بجکر 45 منٹ	8 بجے شام	
111	26 اگست 78ء	میجر محمد حنیف سی ایم ایچ راولپنڈی	9 بجکر 30 منٹ	10 بجکر 45 منٹ	بھٹو صاحب کے دانتوں کے علاج کیلئے آئے
112	26 اگست 78ء	مس بے نظیر بھٹو	11 بجکر 40 منٹ	2 بجکر 55 منٹ	
113	26 اگست 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	6 بجکر 42 منٹ	8 بجکر 5 منٹ	
114	27 اگست 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	6 بجکر 35 منٹ	7 بجکر 40 منٹ	
115	28 اگست 78ء	بیگم نصرت بھٹو	11 بجکر 45 منٹ	ایک بجکر 45	
116	28 اگست 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	6 بجکر 40 منٹ	7 بجکر 40 منٹ	
117	29 اگست 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	6 بجکر 40 منٹ	7 بجکر 45 منٹ	

118	30اگست 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان مسٹر عبدالحفیظ لاکھو	6بجکر 35منٹ	8بجے شام	
119	31اگست 78ء	مسٹر عبدالحفیظ لاکھو	6بجکر 30منٹ	8بجے شام	
120	2ستمبر 78ء	مس بے نظیر بھٹو	11بجکر 25منٹ	ایک بجکر 25منٹ	
121	2ستمبر 78ء	بیگم نصرت بھٹو	2بجکر 20منٹ	4بجکر 35منٹ	
122	2ستمبر 78ء	مسٹر عبدالحفیظ لاکھو	6بجکر 35منٹ	7بجکر 50منٹ	
123	3ستمبر 78ء	مسٹر عبدالحفیظ لاکھو	6بجکر 35منٹ	7بجکر 30منٹ	
124	4ستمبر 78ء	مسٹر عبدالحفیظ لاکھو	6بجکر 30منٹ	7بجکر 40منٹ	
125	5ستمبر 78ء	بیگم نصرت بھٹو	ایک بجکر 35منٹ	5بجکر 20منٹ	
126	6ستمبر 78ء	مسٹر عبدالحفیظ لاکھو	6بجکر 45منٹ	7بجکر 50منٹ	
127	9ستمبر 78ء	مس بے نظیر بھٹو	11بجکر 20منٹ	2بجکر 20منٹ	
128	9ستمبر 78ء	ڈاکٹر رشید سنٹرل گورنمنٹ ہسپتال راولپنڈی	5بجکر 50منٹ	7بجکر 10منٹ	بھٹو صاحب کے دانتوں کا علاج کرنے آئے
129	9ستمبر 78ء	**مسٹر دوست محمد اعوان**	**6بجکر 50منٹ**	**7بجکر 40منٹ**	
130	10ستمبر 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	6بجکر 30منٹ	7بجکر 40منٹ	
131	12ستمبر 78ء	بیگم نصرت بھٹو	11بجے دن	ایک بجکر 50منٹ	
132	12ستمبر 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر دوست محمد اعوان	6بجکر 30منٹ	8بجے شام	

133	13 ستمبر 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار	6 بجکر 20 منٹ	7 بجکر 15 منٹ
		مسٹر دوست محمد اعوان		
134	14 ستمبر 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار	6 بجکر 30 منٹ	7 بجکر 50 منٹ
		مسٹر دوست محمد اعوان		
135	16 ستمبر 78ء	مس بے نظیر بھٹو	10 بجکر 50 منٹ	ایک بجکر 25 منٹ
136	16 ستمبر 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار	6 بجکر 20 منٹ	8 بجکر 30 منٹ
		مسٹر غلام علی میمن	6 بجکر 35 منٹ	8 بجکر 30 منٹ
137	17 ستمبر 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	6 بجکر 40 منٹ	7 بجکر 50 منٹ
		مسٹر غلام علی میمن		
138	18 ستمبر 78ء	مسٹر عبدالحفیظ لاکھو	6 بجکر 30 منٹ	7 بجکر 35 منٹ
		مسٹر غلام علی میمن		
139	19 ستمبر 78ء	ڈاکٹر محمد اسلم ارشد	10 بجے صبح	10 بجکر 30 منٹ
140	19 ستمبر 78ء	بیگم نصرت بھٹو	10 بجکر 50 منٹ	ایک بجکر 35 منٹ
141	19 ستمبر 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار	6 بجکر 40 منٹ	8 بجکر 10 منٹ
		مسٹر غلام علی میمن		
142	20 ستمبر 78ء	مسٹر غلام علی میمن	6 بجکر 45 منٹ	7 بجکر 45 منٹ
		مسٹر عبدالحفیظ لاکھو		

143	21 ستمبر 78ء	مسٹر غلام علی میمن مسٹر عبدالحفیظ لاکھو	6 بجکر 30 منٹ	7 بجکر 45 منٹ	
144	22 ستمبر 78ء	ڈاکٹر محمد اسلم ارشد	5 بجکر 20 منٹ	5 بجکر 40 منٹ	
145	23 ستمبر 78ء	مس بے نظیر بھٹو	11 بجکر 30 منٹ	ایک بجکر 40 منٹ	
146	23 ستمبر 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	6 بجکر 37 منٹ	7 بجکر 55 منٹ	
147	24 ستمبر 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان مسٹر غلام علی میمن	6 بجکر 50 منٹ	7 بجکر 55 منٹ	
148	25 ستمبر 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	6 بجکر 40 منٹ	7 بجکر 55 منٹ	
149	26 ستمبر 78ء	بیگم نصرت بھٹو	10 بجکر 30 منٹ	ایک بجکر 35 منٹ	
150	26 ستمبر 78ء	مسٹر غلام علی میمن مسٹر دوست محمد اعوان	6 بجکر 30 منٹ	7 بجکر 50 منٹ	
151	27 ستمبر 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	6 بجکر 30 منٹ	8 بجے شام	
152	27 ستمبر 78ء	میڈیکل سپرنٹنڈنٹ اکرام الحق ڈینٹل سرجن طارق محمود	9 بجکر 30 منٹ 〃	9 بجکر 45 منٹ 〃	بھٹو صاحب کا میڈیکل چیک اپ

		ڈاکٹر اسلم ارشد	9بجکر 35منٹ	″
153	28 ستمبر 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار	6بجکر 35منٹ	7بجکر 55منٹ
		مسٹر غلام علی میمن		
154	30 ستمبر 78ء	مس بے نظیر بھٹو	11بجکر 45منٹ	2بجکر 15منٹ
155	30 ستمبر 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	6بجکر 30منٹ	7بجکر 50منٹ
		مسٹر غلام علی میمن		
156	یکم اکتوبر 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار	6بجکر 30منٹ	7بجکر 50منٹ
		مسٹر دوست محمد اعوان		
157	2اکتوبر 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	6بجکر 40منٹ	7بجکر 40منٹ
		مسٹر غلام علی میمن		
158	3اکتوبر 87ء	بیگم نصرت بھٹو	11بجکر 45منٹ	2بجکر 15منٹ
159	3اکتوبر 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار	6بجکر 45منٹ	7بجکر 50منٹ
		مسٹر غلام علی میمن		
160	4اکتوبر 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار	6بجکر 35منٹ	7بجکر 35منٹ
		مسٹر دوست محمد اعوان		
161	5اکتوبر 78ء	مسٹر غلام علی میمن	6بجکر 35منٹ	7بجکر 35منٹ
162	7اکتوبر 78ء	مس بے نظیر بھٹو	11بجکر 50منٹ	2بجکر 10منٹ

163	7 اکتوبر 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	6 بجکر 30 منٹ	7 بجکر 40 منٹ
		مسٹر غلام علی میمن		
164	8 اکتوبر 78ء	مسٹر یحیٰ بختیار، غلام علی میمن	6 بجکر 30 منٹ	7 بجکر 40 منٹ
165	9 اکتوبر 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	6 بجکر 30 منٹ	7 بجکر 35 منٹ
		مسٹر غلام علی میمن		
166	10 اکتوبر 78ء	بیگم نصرت بھٹو	11 بجکر 15 منٹ	ایک بجکر 50 منٹ
167	10 اکتوبر 78ء	مسٹر یحیٰ بختیار		
		مسٹر غلام علی میمن	6 بجکر 30 منٹ	7 بجکر 45 منٹ
168	11 اکتوبر 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	6 بجکر 30 منٹ	7 بجکر 35 منٹ
		مسٹر عبدالحفیظ لاکھو		
169	12 اکتوبر 78ء	مسٹر یحیٰ بختیار	6 بجکر 30 منٹ	7 بجکر 35 منٹ
		مسٹر غلام علی میمن		
170	14 اکتوبر 78ء	مس بے نظیر بھٹو	11 بجکر 20 منٹ	ایک بجکر 45 منٹ
171	14 اکتوبر 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	7 بجے شام	8 بجکر 5 منٹ
		مسٹر عبدالحفیظ لاکھو		
172	15 اکتوبر 78ء	مسٹر یحیٰ بختیار	6 بجکر 40 منٹ	7 بجکر 40 منٹ
		مسٹر غلام علی میمن		

مسٹر یحیٰ بختیار ،

173	16اکتوبر 78ء	مسٹردوست محمد اعوان مسٹرغلام علی میمن	7بجکر 5منٹ	8بجے شام
174	17اکتوبر 78ء	بیگم نصرت بھٹو	ایک بجکر 15منٹ	3بجکر 30منٹ
175	17اکتوبر 78ء	مسٹریحییٰ بختیار مسٹرغلام علی میمن	7بجے شام	8بجے شام
176	18اکتوبر 78ء	مسٹردوست محمد اعوان مسٹرغلام علی میمن	7بجکر 5منٹ	8بجے شام
177	19اکتوبر 78ء	مسٹرصدیق کھرل	4بجکر 35منٹ	5بجکر 55منٹ
178	19اکتوبر 78ء	مسٹردوست محمد اعوان مسٹرغلام علی میمن	7بجکر 5منٹ	8بجکر 10منٹ
179	21اکتوبر 78ء	مس بے نظیر بھٹو	11بجکر 15منٹ	ایک بجکر 40منٹ
180	21اکتوبر 78ء	مسٹریحییٰ بختیار مسٹرغلام علی میمن	7بجکر 5منٹ	8بجے شام
181	22اکتوبر 78ء	مسٹردوست محمد اعوان مسٹرعبدالحفیظ لاکھو	7بجکر 5منٹ	8بجکر 10منٹ
182	23اکتوبر 78ء	مسٹریحییٰ بختیار مسٹرغلام علی میمن	7بجے شام	8بجے شام

183	24 اکتوبر 78ء	بیگم نصرت بھٹو	12 بجکر 25 منٹ	2 بجکر 40 منٹ
184	24 اکتوبر 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	7 بجے شام	8 بجے شام
185	25 اکتوبر 78ء	مسٹر غلام علی میمن مسٹر عبدالحفیظ لاکھو	4 بجکر 30 منٹ	5 بجکر 30 منٹ
186	26 اکتوبر 78ء	مسٹر غلام علی میمن مسٹر عبدالحفیظ لاکھو	4 بجکر 30 منٹ	5 بجکر 30 منٹ
187	28 اکتوبر 78ء	مس بے نظیر بھٹو	12 بجکر 40 منٹ	2 بجکر 50 منٹ
188	28 اکتوبر 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان مسٹر عبدالحفیظ لاکھو	4 بجکر 40 منٹ	5 بجکر 40 منٹ
189	29 اکتوبر 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان مسٹر غلام علی میمن	4 بجکر 30 منٹ	5 بجکر 30 منٹ
190	30 اکتوبر 78ء	مسٹر نسیم الاسلام بیگم منور الاسلام	12 بجکر 5 منٹ	2 بجے بعد دوپہر
191	30 اکتوبر 78ء	مسٹر غلام علی میمن مسٹر عبدالحفیظ لاکھو	4 بجکر 40 منٹ	5 بجکر 40 منٹ

192	31 اکتوبر 78ء	بیگم نصرت بھٹو	12 بجکر 15 منٹ	2 بجکر 35 منٹ
193	31 اکتوبر 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	4 بجکر 40 منٹ	5 بجکر 40 منٹ
		مسٹر عبدالحفیظ لاکھو		
194	یکم نومبر 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار	4 بجکر 30 منٹ	5 بجکر 30 منٹ
		مسٹر غلام علی میمن		
195	2 نومبر 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	4 بجکر 30 منٹ	5 بجکر 40 منٹ
		مسٹر عبدالحفیظ لاکھو	4 بجکر 40 منٹ	"
196	4 نومبر 78ء	مس بے نظیر بھٹو	11 بجکر 25 منٹ	ایک بجکر 55 منٹ
197	4 نومبر 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	4 بجکر 30 منٹ	5 بجکر 30 منٹ
		مسٹر غلام علی میمن		
198	5 نومبر 78ء	مسٹر نسیم الاسلام	11 بجکر 15 منٹ	12 بجکر 15 منٹ
		مسز منور الاسلام		
199	5 نومبر 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار	4 بجکر 30 منٹ	5 بجکر 30 منٹ
		مسٹر غلام علی میمن		
200	6 نومبر 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	4 بجکر 35 منٹ	5 بجکر 35 منٹ
		مسٹر عبدالحفیظ لاکھو		
201	7 نومبر 78ء	بیگم نصرت بھٹو	12 بجکر 25 منٹ	2 بجکر 5 منٹ

202	7نومبر 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	4بجکر 30منٹ	5بجکر 40منٹ
203	11نومبر 78ء	مس بے نظیر بھٹو	11بجکر 35منٹ	ایک بجکر 40منٹ
204	12نومبر 78ء	بیگم نصرت بھٹو مس بے نظیر	11بجکر 30منٹ "	3بجکر 50منٹ "
205	13نومبر 78ء	مسٹر نسیم الاسلام مسز منور الاسلام	10بجکر 55منٹ	ایک بجکر 30منٹ
206	14نومبر 78ء	بیگم نصرت بھٹو	11بجکر 25منٹ	ایک بجکر 45منٹ
207	14نومبر 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار	4بجکر 30منٹ	5بجکر 30منٹ
208	14نومبر 78ء	ڈاکٹر عظیم	6بجکر 30منٹ	7بجے شام
209	15نومبر 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان مسٹر عبدالحفیظ لاکھو	4بجکر 30منٹ	5بجکر 35منٹ
210	16نومبر 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	4بجکر 30منٹ	5بجکر 30منٹ
211	19نومبر 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان مسٹر عبدالحفیظ لاکھو	4بجکر 30منٹ	5بجکر 30منٹ

212	20نومبر78ء	مسٹر دوست محمد اعوان مسٹر عبدالحفیظ لاکھو	4بجکر 30منٹ	5بجکر 30منٹ
213	21نومبر78ء	بیگم نصرت بھٹو	11بجکر 30منٹ	2بجکر 45منٹ
214	21نومبر78ء	مسٹر دوست محمد اعوان مسٹر غلام علی میمن	4بجکر 40منٹ	5بجکر 40منٹ
215	22نومبر78ء	مسٹر عبدالحفیظ لاکھو مسٹر دوست محمد اعوان	4بجکر 30منٹ	5بجکر 45منٹ
216	23نومبر78ء	مسٹر دوست محمد اعوان مسٹر غلام علی میمن	4بجکر 30منٹ	5بجکر 30منٹ
217	24نومبر78ء	ڈاکٹر ظفر نیازی	11بجکر 25منٹ	2بجکر 40منٹ
218	25نومبر78ء	مس بے نظیر بھٹو	12بجکر 25منٹ	3بجکر 10منٹ
219	25نومبر78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	4بجکر 30منٹ	5بجکر 20منٹ
220	26نومبر78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	4بجکر 35منٹ	5بجکر 35منٹ
221	27نومبر78ء	ڈاکٹر ظفر نیازی	11بجکر 30منٹ	12بجکر 45منٹ
222	27نومبر78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر دوست محمد اعوان	4بجکر 30منٹ	5بجکر 30منٹ

223	28 نومبر 78ء	بیگم نصرت بھٹو	11 بجکر 25 منٹ	2 بجے دوپہر
224	28 نومبر 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	4 بجکر 30 منٹ	5 بجکر 30 منٹ
225	29 نومبر 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	4 بجکر 30 منٹ	5 بجکر 30 منٹ
226	30 نومبر 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار	4 بجکر 30 منٹ	5 بجکر 30 منٹ
227	2 دسمبر 78ء	مس بے نظیر بھٹو	11 بجکر 35 منٹ	ایک بجکر 45 منٹ
228	2 دسمبر 78ء	مسٹر غلام علی میمن	4 بجکر 30 منٹ	5 بجکر 30 منٹ
		مسٹر عبدالحفیظ لاکھو		
229	3 دسمبر 78ء	ڈاکٹر ظفر نیازی ' ڈاکٹر چیمہ	12 بجے دوپہر	2 بجے بعد دوپہر
230	3 دسمبر 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار	4 بجکر 40 منٹ	5 بجکر 30 منٹ
		مسٹر غلام علی میمن		
231	4 دسمبر 78ء	مسٹر یحییٰ بختیار	2 بجکر 30 منٹ	4 بجکر 30 منٹ
		مسٹر غلام علی میمن		
232	5 دسمبر 78ء	بیگم نصرت بھٹو	11 بجکر 3 منٹ	2 بجے بعد دوپہر
233	5 دسمبر 78ء	مسٹر غلام علی میمن	4 بجکر 30 منٹ	5 بجکر 30 منٹ
		مسٹر عبدالحفیظ لاکھو		
234	6 دسمبر 78ء	مسٹر دوست محمد اعوان	4 بجکر 30 منٹ	5 بجکر 35 منٹ

235	7دسمبر78ء	مسٹر عبدالحفیظ لاکھو مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	4بجکر30منٹ	5بجکر30منٹ
236	9دسمبر78ء	مس بے نظیر بھٹو	11بجکر30منٹ	2بجے دوپہر
237	9دسمبر78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	4بجکر35منٹ	5بجکر35منٹ
238	10دسمبر78ء	ڈاکٹر ظفر نیازی 'ڈاکٹر چیمہ	ایک بجکر45منٹ	4بجے بعد دوپہر
239	13دسمبر78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	4بجکر30منٹ	5بجکر45منٹ
240	14دسمبر78ء	مسٹر غلام علی میمن مسٹر عبدالحفیظ لاکھو	4بجکر30منٹ	5بجکر45منٹ
241	15دسمبر78ء	جیل ڈاکٹر	7بجکر25منٹ	7بجکر30منٹ
242	16دسمبر78ء	مس بے نظیر بھٹو	11بجکر35منٹ	2بجکر20منٹ
243	16دسمبر78ء	ڈاکٹر حفیظ اختر ڈاکٹر عظیم	4بجکر10منٹ	4بجکر45منٹ
244	16دسمبر78ء	مسٹر یحییٰ بختیار مسٹر غلام علی میمن	4بجکر55منٹ	6بجے شام

245	17 دسمبر 78ء	مجیب پیرزادہ	9 بجکر 55 منٹ	11 بجکر 55 منٹ
246	″	یحییٰ بختیار غلام علی میمن	4 بجکر 30 منٹ	5 بجکر 30 منٹ
247	18 دسمبر 78ء	دوست محمد اعوان عبدالحفیظ لاکھو	4 بجکر 30 منٹ	5 بجکر 55 منٹ
248	19 دسمبر 78ء	یحییٰ بختیار غلام علی میمن	4 بجکر 45 منٹ	5 بجکر 45 منٹ
249	20 دسمبر 78ء	یحییٰ بختیار غلام علی میمن	4 بجکر 40 منٹ	5 بجکر 40 منٹ
250	21 دسمبر 78ء	دوست محمد اعوان عبدالحفیظ لاکھو	4 بجکر 40 منٹ	5 بجکر 40 منٹ
251	22 دسمبر 78ء	بیگم نصرت بھٹو	11 بجکر 30 منٹ	ایک بجکر 55 منٹ بعد دوپہر
252	″	امداد بھٹو مس رخسانہ بھٹو مس شبنم بھٹو	2 بجکر 15 منٹ بعد دوپہر	3 بجکر 50 منٹ
353	23 دسمبر 78ء	مس بے نظیر بھٹو	11 بجکر 40 منٹ	ایک بجکر 35 منٹ بعد دوپہر

254	23دسمبر 78ء	یحییٰ بختیار غلام علی میمن	4بجکر 30منٹ	5بجکر 35منٹ	
255	25دسمبر 78ء	ڈاکٹر ظفر نیازی، ڈاکٹر چیمہ	10بجکر 30منٹ	11بجکر 35منٹ	بھٹو صاحب کے دانتوں کے علاج کیلئے
256	27دسمبر 78ء	ڈاکٹر اصغر علی شاہ (جیل ڈاکٹر)	3بجکر 55منٹ	4بجکر 5منٹ بعد دوپہر	جیل ڈاکٹر بھٹو صاحب کے پیٹ میں تکلیف کی وجہ سے انکے پاس گیا
257	28دسمبر 78ء	بیگم نصرت بھٹو	11بجکر 25منٹ	ایک بجکر 30منٹ بعد دوپہر	
258	30دسمبر 78ء	مس بے نظیر بھٹو	11بجکر 35منٹ	ایک بجکر 30منٹ بعد دوپہر	
259	30دسمبر 78ء	محترمہ شیریں امیر بیگم	2بجے بعد دوپہر	4بجے بعد دوپہر	
260	یکم جنوری 79ء	بیگم نصرت بھٹو	11بجکر 25منٹ	ایک بجکر 35منٹ	
261	6جنوری 79ء	مس بے نظیر بھٹو	11بجکر 35منٹ	ایک بجکر 45منٹ	
262	7جنوری 79ء	ڈاکٹر زمان چودھری مختار احمد عزیز الرحمٰن	12بجکر 55منٹ	ایک بجے بعد دوپہر	
263	9جنوری 79ء	بیگم نصرت بھٹو	11بجکر 45منٹ	ایک بجکر 45منٹ	
264	12جنوری 79ء	مس بے نظیر بھٹو	12بجے دوپہر	2بجے بعد دوپہر	
265	15جنوری 79ء	مسٹر مظفر علی بھٹو	9بجکر 40منٹ	11بجے صبح	

266	15جنوری 79ء	ڈاکٹر زینت بیتھالوجسٹ سنٹرل ہسپتال راولپنڈی	11.بجکر 25منٹ	12.بجکر 35منٹ	
267	20جنوری 79ء	مس بے نظیر بھٹو	11.بجکر 30منٹ	ایک.بجکر 30منٹ	بھٹو صاحب کا کتا بھی جیل لائیں
268	20جنوری 79ء	یحییٰ بختیار	3بجے بعد دوپہر	5.بجکر 15منٹ	
269	22جنوری 79ء	بیگم نصرت بھٹو	12.بجکر 5منٹ	2.بجکر 15منٹ	
270	24جنوری 79ء	ڈاکٹر کے اے عظیم۔ ڈاکٹر حفیظ اختر	3بجے بعد دوپہر	3.بجکر 45منٹ	
271	27جنوری 79ء	مس بے نظیر بھٹو	11.بجکر 30منٹ	2بجے بعد دوپہر	
272	30جنوری 79ء	بیگم نصرت بھٹو	11.بجکر 25منٹ	2.بجکر 10منٹ	
273	یکم فروری 79ء	ڈاکٹر خالد محمود اعوان	11.بجکر 45منٹ	12.بجکر 10منٹ	
274	3فروری 79ء	مس بے نظیر بھٹو	11.بجکر 30منٹ	ایک.بجکر 35منٹ	
275	3فروری 79ء	ڈاکٹر ظفر نیازی، ڈاکٹر سلیم چیمہ	ایک.بجکر 50منٹ	4بجے بعد دوپہر	بھٹو صاحب کے دانتوں کے علاج کیلئے آئے۔
276	5فروری 79ء	نبی بخش بھٹو	11بجے	ایک بجے بعد دوپہر	
277	6فروری 79ء	بیگم نصرت بھٹو	12.بجکر 20منٹ	12.بجکر 50منٹ	بیگم نصرت بھٹو اسلام آباد میں پولیس کی نگرانی سے بغیر اجازت نکل آئیں اور جیل پہنچ گئیں۔

278	6فروری 79ء	یحییٰ بختیار غلام علی میمن	4.بجکر 50منٹ	5.بجکر 40منٹ
279	7فروری 79ء	دوست محمد اعوان عبدالحفیظ لاکھو	11.بجکر 55منٹ	ایک.بجکر 25منٹ
280	8فروری 79ء	بیگم نصرت بھٹو	11.بجکر 20منٹ	ایک.بجکر 30منٹ
281	8فروری 79ء	یحییٰ بختیار غلام علی میمن	4.بجکر 10منٹ	5.بجکر 20منٹ
282	9فروری 79ء	یحییٰ بختیار	12بجے دوپہر	ایک.بجکر 5منٹ
283	10فروری 79ء	یحییٰ بختیار غلام علی میمن	12بجے دوپہر	ایک.بجکر 10منٹ
284	11فروری 79ء	مس بے نظیر بھٹو	11.بجکر 45منٹ	2.بجکر 20منٹ
285	11فروری 79ء	یحییٰ بختیار غلام علی میمن	4بجے بعد دوپہر	5بجے شام
286	12فروری 79ء	مظفر مصطفیٰ بیگم مصطفیٰ	12.بجکر 30منٹ	2.بجکر 10منٹ
287	13فروری 79ء	بیگم نصرت بھٹو	11.بجکر 55منٹ	2.بجکر 10منٹ

288	13فروری 79ء	یحیٰ بختیار غلام علی میمن	4.بجکر 10 منٹ	5.بجکر 5 منٹ
289	14فروری 79ء	نسیم الاسلام منورالاسلام	10.بجکر 35 منٹ	12.بجکر 40 منٹ
290	14فروری 79ء	حفیظ پیرزادہ یٰسین وٹو	4.بجکر 15 منٹ	5.بجکر 40 منٹ
291	15فروری 79ء	غلام علی میمن عبدالحفیظ لاکھو	12 بجے دوپہر	ایک بجے بعددوپہر
292	17فروری 79ء	مس بے نظیر بھٹو	11.بجکر 40 منٹ	2.بجکر 5 منٹ
293	17فروری 79ء	عبدالحفیظ پیرزادہ	4.بجکر 35 منٹ	5.بجکر 35 منٹ
294	18فروری 79ء	عبدالحفیظ پیرزادہ یحیٰ بختیار	4.بجکر 30 منٹ	5.بجکر 45 منٹ
295	19فروری 79ء	عبدالحفیظ پیرزادہ	4.بجکر 30 منٹ	5.بجکر 30 منٹ
296	20فروری 79ء	بیگم نصرت بھٹو	11.بجکر 30 منٹ	ایک.بجکر 50 منٹ
297	20فروری 79ء	عبدالحفیظ پیرزادہ	4.بجکر 5 منٹ	5.بجکر 5 منٹ
298	21فروری 79ء	نسیم الاسلام بیگم منورالاسلام	10 بجے صبح	12 بجے بعددوپہر

299	21فروری 79ء	یحییٰ بختیار غلام علی میمن	4بجکر 10منٹ	5بجے شام
300	22فروری 79ء	محفوظ خان بھٹو	10بجکر 40منٹ	12بجکر 40منٹ
301	22فروری 79ء	یحییٰ بختیار غلام علی میمن	4بجکر 20منٹ	5بکر 20منٹ
302	24فروری 79ء	مس بے نظیر بھٹو	11بجکر 30منٹ	ایک بجکر 45منٹ
303	24فروری 79ء	عبدالحفیظ پیرزادہ	4بجکر 10منٹ	5بجکر 40منٹ
304	25فروری 79ء	عبدالحفیظ پیرزادہ یحییٰ بختیار	4بجے بعد دوپہر	5بجکر 30منٹ
305	26فروری 79ء	ممتاز علی بھٹو	11بجکر 30منٹ	ایک بجکر 30منٹ
306	26فروری 79ء	دوست محمد اعوان غلام علی میمن	4بجکر 10منٹ	5بجکر 15منٹ
307	27فروری 79ء	بیگم نصرت بھٹو	11بجکر 30منٹ	ایک بجکر 45منٹ
308	27فروری 79ء	یحییٰ بختیار غلام علی میمن	4بجکر 30منٹ	5بجکر 30منٹ
309	28فروری 79ء	مشتاق علی بھٹو	11بجکر 5منٹ	ایک بجکر 20منٹ

SITE PLAN OF DISTRICT JAIL
RAWALPINDI

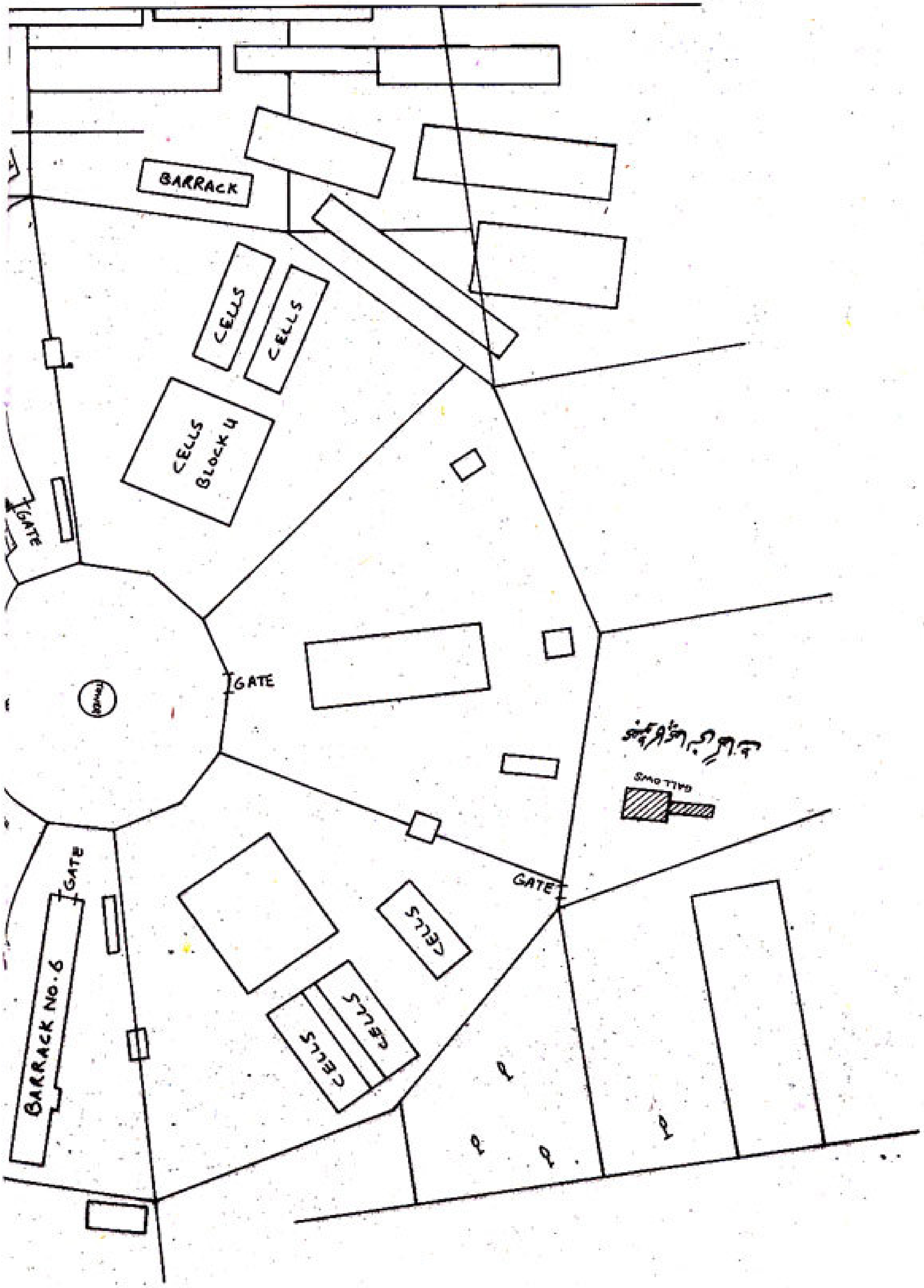

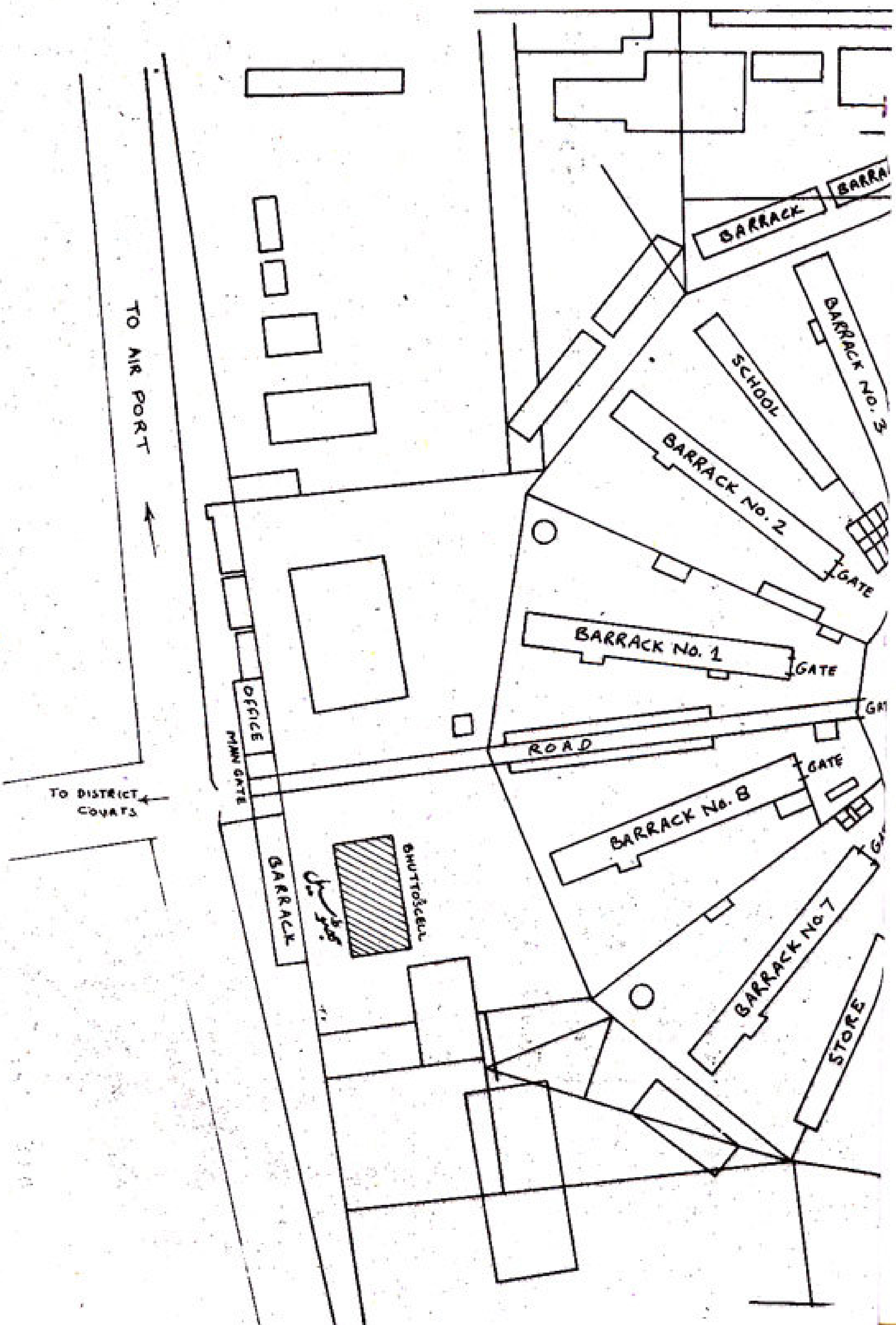
TO AIR PORT
BARRACK
BARRACK No. 3
SCHOOL
BARRACK No. 2
GATE
BARRACK No. 1
GATE
ROAD
GATE
BARRACK No. 8
BARRACK No. 7
STORE
OFFICE
MAIN GATE
TO DISTRICT COURTS
BARRACK
BHUTTO'S CELL

310	28 فروری 79ء	یحییٰ بختیار	4 بجکر 20 منٹ	5 بجکر 20 منٹ	
		غلام علی میمن			
311	یکم مارچ 79ء	نسیم الاسلام	11 بجکر 30 منٹ	ایک بجکر 40 منٹ	
		بیگم منور الاسلام			
312	یکم مارچ 79ء	دوست محمد اعوان	4 بجے شام	5 بجکر 15 منٹ	
		عبدالحفیظ لاکھو			
313	3 مارچ 79ء	مس بے نظیر بھٹو	11 بجکر 30 منٹ	ایک بجکر 50 منٹ	
314	3 مارچ 79ء	عبدالحفیظ پیرزادہ	4 بجکر 10 منٹ	5 بجکر 50 منٹ	
		یحییٰ بختیار	4 بجکر 35 منٹ		
315	4 مارچ 79ء	عبدالحفیظ پیرزادہ	4 بجکر 20 منٹ	5 بجکر 30 منٹ	
		غلام علی میمن			
316	5 مارچ 79ء	عبدالحفیظ پیرزادہ	9 بجکر 50 منٹ	10 بجکر 45 منٹ	
317	5 مارچ 79ء	یحییٰ بختیار	4 بجکر 30 منٹ	5 بجکر 45 منٹ	غلام علی میمن کی آخری ملاقات
		غلام علی میمن			
318	6 مارچ 79ء	بیگم نصرت بھٹو	11 بجکر 35 منٹ	2 بجکر 20 منٹ	
319	6 مارچ 79ء	عبدالحفیظ پیرزادہ	4 بجکر 40 منٹ	6 بجکر 10 منٹ شام	
		یحییٰ بختیار			

320	7مارچ 79ء	نسیم الاسلام		
		بیگم منورالاسلام	11بجکر 15منٹ	ایک بجکر 40منٹ
321	7مارچ 79ء	عبدالحفیظ پیرزادہ	4بجکر 35منٹ	6بجکر 5منٹ
		یحیٰ بختیار	5بجکر 10منٹ	
322	8مارچ 79ء	محترمہ شیریں امیر بیگم بھٹو	11بجکر 30منٹ	12بجکر 35منٹ
323	8مارچ 79ء	عبدالحفیظ پیرزادہ	4بجکر 20منٹ	5بجکر 20منٹ
		دوست محمد اعوان		
324	10مارچ 79ء	مس بے نظیر بھٹو	11بجکر 30منٹ	ایک بجکر 40منٹ
325	12مارچ 79ء	عبدالحفیظ پیرزادہ	4بجے شام	5بجے شام
326	13مارچ 79ء	بیگم نصرت بھٹو	11بجکر 30منٹ	ایک بجکر 45منٹ
327	13مارچ 79ء	عبدالحفیظ پیرزادہ	4بجے شام	5بجے شام
328	14مارچ 79ء	نسیم الاسلام	11بجکر 30منٹ	ایک بجکر 35منٹ
		بیگم منورالاسلام		
329	14مارچ 79ء	یحیٰ بختیار	4بجکر 5منٹ	5بجے شام
330	15مارچ 79ء	یحیٰ بختیار	4بجکر 10منٹ	5بجے شام
331	17مارچ 79ء	مس بے نظیر بھٹو	11بجکر 25منٹ	ایک بجکر 45منٹ

332	17 مارچ 79ء	عبدالحفیظ پیرزادہ یحییٰ بختیار	4 بجکر 10 منٹ	5 بجے شام	
333	18 مارچ 79ء	محفوظ بھٹو	11 بجکر 45 منٹ	ایک بجکر 45 منٹ	
334	18 مارچ 79ء	عبدالحفیظ پیرزادہ	4 بجکر 50 منٹ	6 بجے شام	
335	19 مارچ 79ء	عبدالحفیظ پیرزادہ یحییٰ بختیار	4 بجکر 5 منٹ	5 بجکر 15 منٹ	
336*	20 مارچ 79ء	بیگم نصرت بھٹو	11 بجکر 30 منٹ	ایک بجکر 45 منٹ	
337	20 مارچ 79ء	یحییٰ بختیار عبدالحفیظ لاکھو	4 بجے شام	5 بجے شام	
338	21 مارچ 79ء	عبدالحفیظ لاکھو	4 بجے شام	5 بجے شام	
339	22 مارچ 79ء	ممتاز علی بھٹو	11 بجکر 35 منٹ	ایک بجکر 35 منٹ	
340	22 مارچ 79ء	عبدالحفیظ لاکھو	4 بجے شام	5 بجے شام	
341	24 مارچ 79ء	یحییٰ بختیار	12 بجے دوپہر	12 بجکر 5 منٹ	یحییٰ بختیار کی بھٹو صاحب کے ساتھ آخری ملاقات
342	26 مارچ 79ء	بیگم نصرت بھٹو مس بے نظیر بھٹو	11 بجکر 25 منٹ	12 بجکر 25 منٹ	

343	26مارچ 79ء	طارق الاسلام	12بجکر 50منٹ	ایک بجکر 25منٹ	
344	28مارچ 79ء	محفوظ بھٹو	12بجکر 15منٹ	12بجکر 47منٹ	
345	28مارچ 79ء	نسیم الاسلام بیگم منور الاسلام	ایک بجکر 45منٹ	2بجکر 30منٹ	
346	29مارچ 79ء	عبدالحفیظ پیرزادہ	4بجکر 35منٹ	5بجکر 55منٹ	
347	31مارچ 79ء	مس بے نظیر بھٹو	10بجکر 50منٹ	11بجکر 25منٹ	
348	31مارچ 79ء	محترمہ شیریں امیر بیگم	11بجکر 55منٹ	12بجکر 30منٹ	
349	31مارچ 79ء	عبدالحفیظ پیرزادہ	ایک بجکر 5منٹ	دو بجکر 10منٹ	
350	31مارچ 79ء	مظفر مصطفیٰ بیگم مظفر مصطفیٰ	2بجکر 35منٹ	3بجکر 5منٹ	
351	31مارچ 79ء	طارق الاسلام	3بجکر 15منٹ	3بجکر 45منٹ	
352	یکم اپریل 79ء	محترمہ شاہ بانو رخسانہ بیگم شبنم بیگم	9بجکر 30منٹ	10بجے صبح	
353	یکم اپریل 79ء	ممتاز علی بھٹو	11بجکر 30منٹ	12بجے دوپہر	
354	3اپریل 79ء	بیگم نصرت بھٹو مس بے نظیر بھٹو	11بجکر 30منٹ	2بجے بعد دوپہر	آخری ملاقات

SKETCH OF THE SECURITY WARD

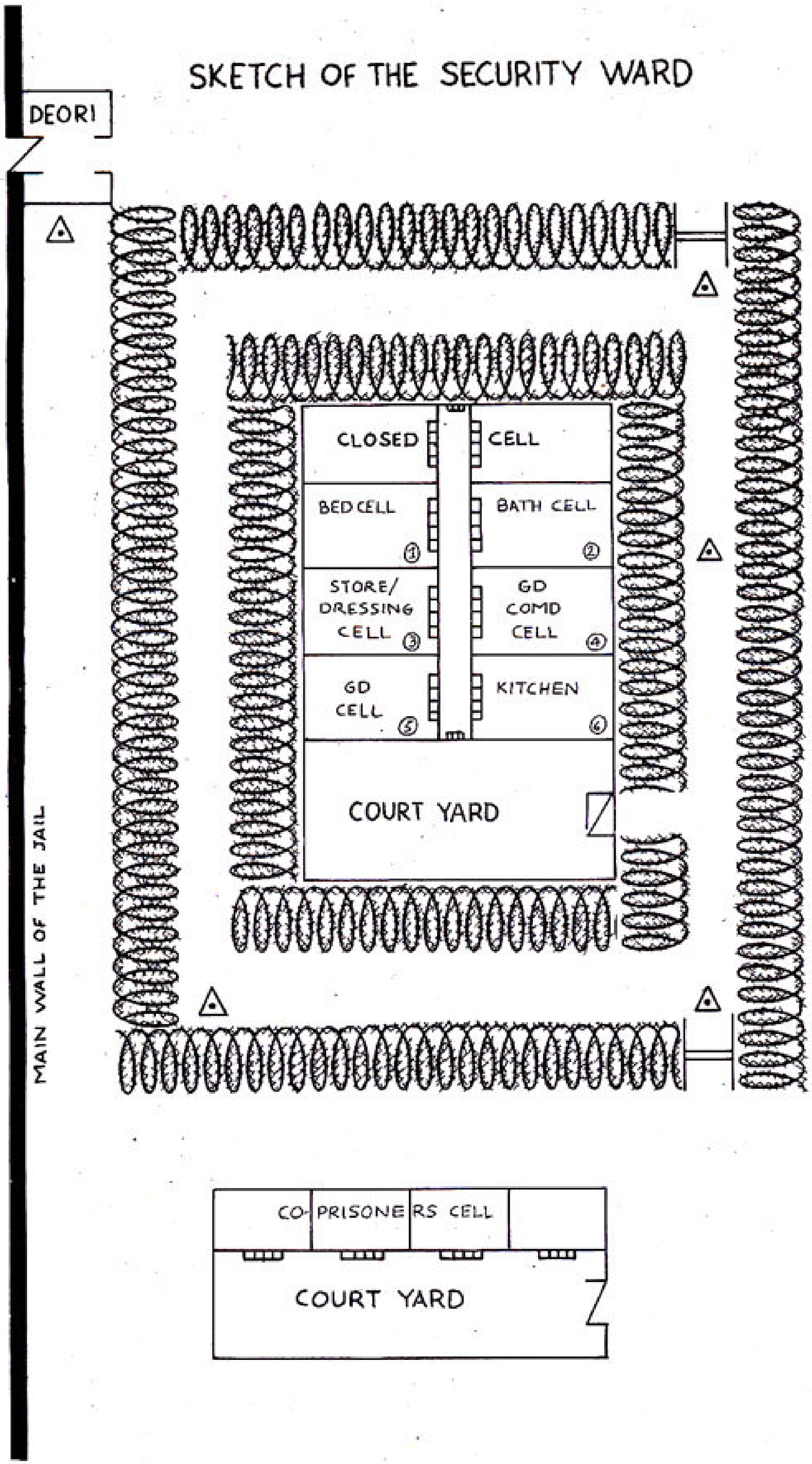

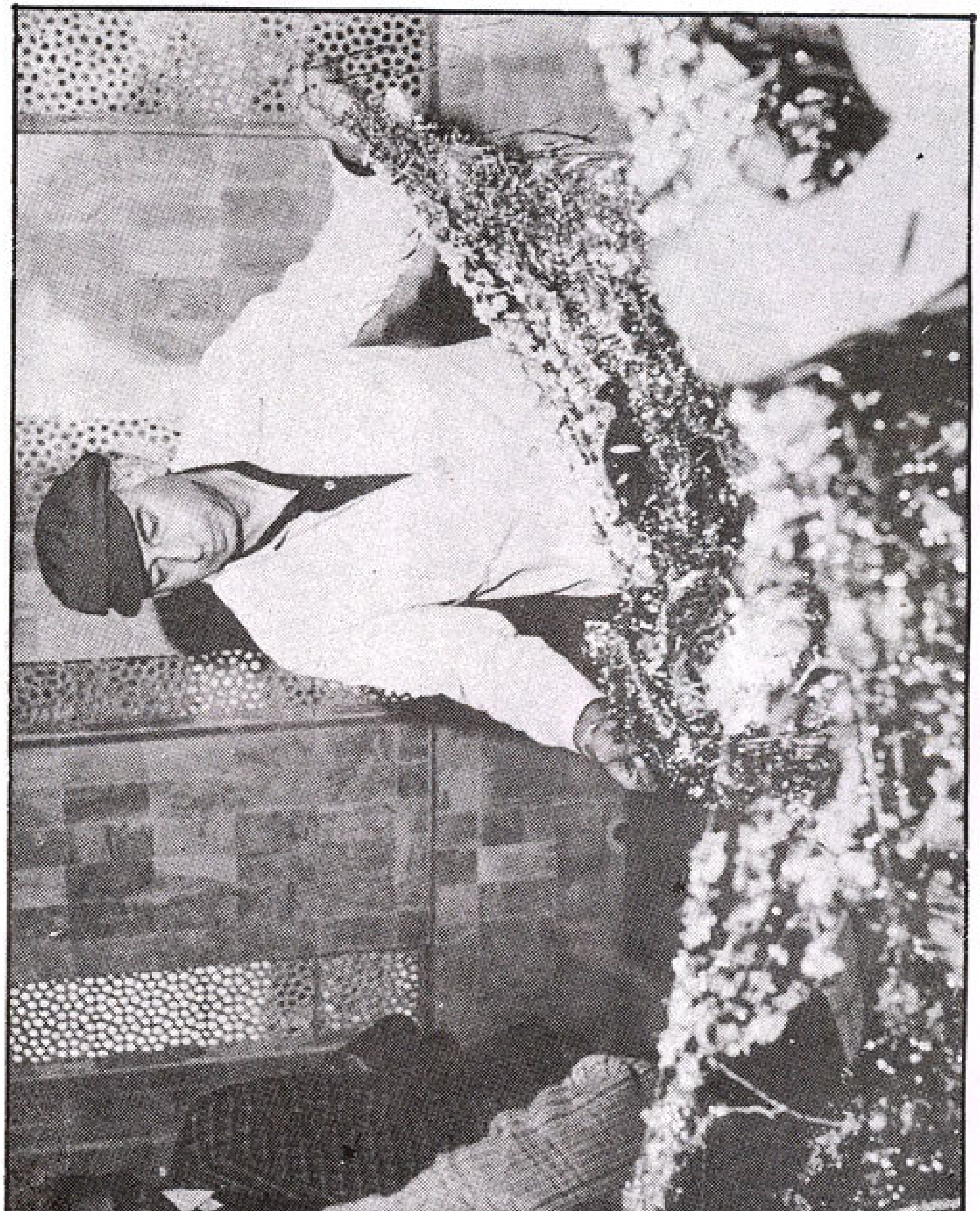

تعارف مصنف

کرنل رفیع الدین ستمبر 1933ء میں ضلع چکوال تحصیل تلہ گنگ کے گاؤں کوٹ قاضی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم تلہ گنگ اور باقی کراچی میں حاصل کی۔ اپریل 1958ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول سے عسکری تربیت حاصل کرنے کے بعد پاک فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ 19 پنجاب شیر شاہ بٹالین سے اپنی فوجی زندگی کا آغاز کیا۔ 1971ء میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی پا کر اسی پلٹن کی کمان حاصل کی۔ آٹھ سال سپیشل سروس گروپ (کمانڈو) میں خدمات سرانجام دیں۔ 1965ء اور 1971ء کی پاک بھارت جنگوں میں بھرپور حصہ لیا۔

17 مئی 1977ء سے 4 اپریل 1979ء تک کرنل رفیع الدین نے سنٹرل جیل راولپنڈی میں مارشل لاء انتظامیہ کی جانب سے سپیشل سیکیورٹی سپرنٹنڈنٹ کے فرائض سرانجام دیئے جہاں ایک مقدمہ قتل میں ملوث سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو رکھا گیا تھا۔ یہ کتاب ان کے اسی عرصہ ملازمت کے مشاہدات، تجربات اور محسوسات پر مبنی ہے۔

کرنل رفیع الدین نے پاکستانی نمائندے کی حیثیت سے سنٹرل ٹریٹی آرگنائزیشن (CENTO) میں بھی خدمات سرانجام دیں۔ کرنل موصوف انڈونیشیا اور ملائشیا میں ملٹری اتاشی بھی رہے اور آئی ایس آئی میں تعیناتی کے دوران جہاد افغانستان سے بھی متعلق رہے۔ سروس کے دوران انہوں نے مختلف کمان، ٹریننگ اور سٹاف کے فرائض سرانجام دیئے۔ اکتوبر 1988ء میں کرنل کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ آج کل دعوت و تبلیغ میں مشغول ہیں۔